بسمِ اللہ الرحمن الرحیم

مجھے روشنی چاہئیے

ساجد خان

نام کتاب : مجھے روشنی چاہئیے

مصنف : ساجد خان

ٹائیٹل : سردار شکیل احمد / محمد حمید (بانڈہ دلزاک)

ضخامت : صفحات

تاریخ اشاعت: مارچ ۲۰۱۱ء

قیمت.

پبلشرز: سکاھی پرنٹرز

ضلع ایبٹ آباد

رابطہ مصنف

ساجد خان

مکان نمبر 109-محلہ ٹینکی......حویلیاں......ضلع ایبٹ آباد

Mob # :0333-5050775

e-mail: sk_hav@yahoo.com

انتساب

(i)

اپنی بہت ہی شفیق،مہربان

پیاری مرحومہ پھوپھو مبارک جان صاحبہ کے نام

جنہوں نے میری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چنے

(ii)

پیاری بیٹیوں......مریم اور سلمیٰ کے نام

جو میری زِیست کا حاصل ہیں
وہ میرے خون میں شامل ہیں
جو میرے دِل کی دھڑکن ہیں
وہ دونوں رونقِ گلشن ہیں
وہ دونوں مجھ سے ہوں نہ دُور
اک مریم نور اک سلمیٰ نور

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے

طاقت کہاں کہ دِید کا احساں اٹھایئے

فہرست

ساجد خان کے افسانے اور کہانیاں

(معتبر ادباء کے تاثرات)

احمد جاوید(اسلام آباد)

ساجد خان کی کہانیوں کے واقعات اُن چنگاریوں کی طرح ہیں جو ایک بڑے الاؤ سے اُٹھتی ہے...... بہت بلند ہوتی ہیں...... سب کو نظر آتی ہیں مگر پھر راکھ بن کر سروں پہ آ گرتی ہیں۔ ہم جس سماج میں رہتے ہیں اُس میں المیے اور سانحات کئی اسباب سے پھوٹتے ہیں اور ہم اپنی بے خبری، معصومیت، بے بسی اور لاچارگی کے باعث اُن کا شکار بن جانے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ کبھی کوئی المیہ حیطۂ غیب سے متشکل ہوتا ہے اور مقسوم کہلاتا ہے اور کبھی سماجی معاشرتی ناانصافیوں شاخسانہ بن کر سامنے آتا ہے اور دُنیا تاریک کر جاتا ہے۔ ساجد خان نے عام طور پر اپنی بیشتر کہانیوں میں انہی المیوں اور سانحات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ نہایت سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ اپنے گردوپیش کو دیکھا ہے اور حقائق کو جیسا وہ ہیں بغیر کسی لگی لپٹی کے من وعن ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان میں سے اکثر کہانیوں کا اختصاص ان کا اختصار ہے۔ وہ مختصر لکھتے ہیں مگر کہانی اپنا دائرہ ضرور مکمل کرتی ہیں۔ اسلوب میں بھی سادگی اور خلوص کی آمیزش ہے جو تفہیم کو سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ ساجد خان اردو افسانے میں گذشتہ برسوں میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے ہرگز متاثر نہیں ہوئے جو خوش آئند بات ہے۔ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی روایت خود پیدا کریں گے اور اسی سے ان کے مقام کا تعین ہوگا۔

ڈاکٹر محمد وسیم انجم(راولپنڈی)

گذشتہ صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں مختصر افسانہ لکھنے کا انداز داستانی اور محسوساتی تھا۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ’’دنیا کا سب سے انمول رتن‘‘ ۱۹۰۷ء میں ’’زمانہ‘‘ میں شائع ہوا اور پریم چند ہی پہلا کہانی کار تھا جس نے جلد ہی داستانی، رومانی اور ادبِ لطیف جیسی فنی نثر سے رُخ موڑا اور حقیقت نگاری کی نئی راہ دریافت کرتے ہوئے افسانے کو معاشرتی مسائل سے روشناس کرایا تو

افسانوی ادب اُس دور کا نقیب بن گیا اور وہی ادب ابدی حیثیت اختیار کرتا ہے جو قارئین کو متاثر کرے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے والے معاشرے کے نئے اور اچھوتے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں مثلاً آج کل دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لوڈ شیڈنگ نے انسانی زندگی اور صنعتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ معاشی مسائل نے معاشرتی مسائل کو جنم دیا ہے اور خانگی مسائل نے بھی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ یہ مسائل انسانی زندگی کو دیمک کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔

ساجد خان کی کہانیاں ایسے ہی مسائل کی نہ صرف نشاندہی کرتی ہیں بلکہ ان کا حل بھی پیش کرتی ہیں اور ساجد خان کو بے رحم ہاتھوں، روایات واقدار کے نیست ونابود ہونے کا شدید قلق ہے۔ ساجد خان نے ''مجھے روشنی چاہیئے'' میں تہذیب وتمدن کی مٹتی ہوئی نشانیوں اور ذہنوں سے فراموش ہوتے ہوئے ماضی اور زندگی سے منہ موڑ لینے والی دھندلاتی تصویروں کی نقاب کشائی سے آئندہ نسلوں تک ایسے ہی کارہائے نمایاں پیش کئے گئے ہیں۔ اس نے اس کتاب میں قاری کے سامنے معاشرتی وتمدنی تصورات، عادات واطوار، طرز احساس اور زندگی گزارنے کے آداب پیش کئے ہیں۔

''مجھے روشنی چاہیئے'' کا مطالعہ کرنے سے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے اور معاشرے کو درپیش مسائل کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں ایسی سحر آفرین تصاویر پیش کرتی ہیں جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں اور ہمیں اپنے گردوپیش میں گھومتی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ دراصل ساجد خان کی تخلیقی کاوشوں نے معاشرے کو فکری اعتبار بخشا ہے۔ ساجد خان نے ان کہانیوں کو جدید افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی ایک ایسی شعوری مگر کامیاب کوشش کی ہے کہ افسانے پر بھی حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ مثال موبائل فون کی قباحتیں اور دہشت گردی کے ناسور جیسے موضوعات کے چناؤ اور فنی مہارت سے کہانی کی سہل بنت کاری اور مسائل کی نشاندہی سے دیا

جا سکتا ہے جو آج کل کے نوجوانوں کے لئے سبق ہے۔ساجد نے عام فہم زبان استعمال کر کے قاری تک اپنے پیغام کے ابلاغ کو آسان تر بنا دیا ہے۔درحقیقت ساجد خان نے ان کہانیوں کے ذریعے آج کے نوجوانوں کو نا اُمیدی کے کفر سے نکالنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ خاصے کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے اور مطالعے میں وسعت آئے گی جو انہیں بڑے ادباء کی صف میں لے جائے گی......انشاءاللہ!

ڈاکٹر روشن آرا راؤ(اسلام آباد)

راکھ تلے دبی چنگاریوں اور دہکتے کوئلوں کی طرح گردوپیش کے مسائل کہانیوں اور افسانوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔آج بھی افسانوی ادب میں ایسے ہی سلگتے مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔شاید اس لئے کہ ہماری معاشرتی زندگی سے تعبیر ہے۔جو افرادِ معاشرہ کے قلب ونظر میں ہلچل مچاتی،کرب میں مبتلا کرتی بیرونی ماحول کو شکست خوردہ بنا دیتی ہے۔ترقی پذیر اور زوال آمادہ معاشروں میں ایسے تہہ در تہہ مسائل انسانی زندگی کو پستیوں میں دھکیلتے ہیں۔جہاں معاشرتی زندگی کی بھول بھلیوں میں انسانیت دم توڑتی محسوس ہوتی ہے۔یہاں بوسیدگی سے نڈھال انسانیت داغ دار اور روبہ زوال ہے۔معاشی واقتصادی ناہمواری،سیاسی جوڑ توڑ اور باہمی کشمکش نے بلندئ فکر وکردار،احساسِ ذمہ داری اور قانون کی پاسداری اور بالادستی کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے۔اصول وضوابط سے تہی دامن معاشرے میں ہر طرف ہر طرح کے انتشار،بے چینی اور نفسیاتی کشمکش ڈیرے ڈالے ہے۔آج کا لکھاری کرب والم کے ایسے ہی موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے پر مجبور ہے۔اس کا قلم جب بھی اٹھتا ہے ایسی ہی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

ساجد خان کی کتاب ''مجھے روشنی چاہئے''میں شامل افسانہ''آکاش''ایسی ہی کسمپرسی کی داستان ہے جس کا موضوع غربت ہے۔''جناب میرے پاس جوتے نہیں تھے......امی نے کہا جب ابا آئے گا تو خرید کر دے گا......اور میں چار روز تک ابا کی راہ ہی تکتا رہا......استاد نے آکاش کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پاؤں کی جانب دیکھا تو آکاش نے پرانے سے زنانہ چپل پہن

رکھے تھے جن میں اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں گویا مسکرا رہے تھے‘‘۔(آ کاش......)

خودکش حملوں کی زد میں کئی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے ہیں، کتنی امیدیں ناامیدی میں بدل گئی ہیں۔ معاشرتی زندگی تہہ و بالا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ ’’سومی‘‘ اپنے اندر ایسی ہی داستان سمیٹے ہے۔ افسانہ ’’اثاثہ‘‘ والدین کا اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات کی قربانی دے کر اولاد کی تعلیم تربیت کے معاشی و معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔

لوگ غربت سے گھبرا کر افرادِ خانہ کی مالی معاونت کے لئے پاکستان کے کونوں کھدروں سے نکل کر بیرون ملک پہنچ جاتے۔ اپنوں کی یادوں کو سینے میں دفن کئے سال ہا سال وطن سے دُور رہتے ہیں۔ ’’آخری اڑان‘‘ میں ایک ایسے ہی شخص کے اندرونی احساسات کو زبان دی گئی ہے۔ جہاں ایک طرف روپے، درہم، پاؤنڈ اور ڈالر کے عوض دُوریاں خرید لی جاتی ہیں اور دوسری طرف اس کے شب و روز محنت و مزدوری میں گزر جاتے ہیں۔

افسانہ ’’اُس پار‘‘ میں پاک و ہند کی تقسیم کے بطن سے پھوٹنے والے المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ زِندگی اور موت ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ غربت امارت میں جنگ رہتی ہے۔ صحت بیماری پر طنز کرتی ہے۔ بیمار صحت مند کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ امیروں کے لئے بستر کمخواب ہوتے ہیں اور یوں تضادات سے زندگی معمور ہے۔ معاشرے میں ہلچل ہے۔ نیکی اور بدی ہے۔ تنہائی اور ہنگامے ہیں۔ قہقہے اور مایوسیاں ہیں۔ ’’تنہائی‘‘ میں یہی کچھ ہے۔

غربت و افلاس اور پیسے کی ریل پیل سے سماجی اِقدار کی ٹوٹ پھوٹ جیسے موضوعات ساجد خان کے اکثر افسانوں میں شامل ہیں۔ اسی طرح دولت زندگی کے معیار اور رشتوں کو کس طرح متاثر کرتی ہے۔ موبائل فون کی قباحتیں، اپنوں کی عدم توجہ اور مکافاتِ عمل جیسے موضوعات کو بھی ساجد خان نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

مالی نقصان انسان کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنوں کی عدم توجہ سے جینے میں

حسن نہیں رہتا'' پاگل''اسی موضوع کی تفسیر ہے۔غربت اور جہالت میں پروان چڑھنے والی جوانی کے انداز'' نشانی'' میں نمایاں ہیں۔ جائیداد کی تقسیم کسی کو اونچا کر دیتی ہے اور کسی کو بے یارو مددگار......'' سبکدوش' میں یہی کچھ ہے...... ۔زندگی کا ایسا ہی چلن '' گھروندا'' میں نظر آتا ہے۔یتیموں اور مساکین کی اِملاک پر قبضہ گروپ عیش کرتے ہیں اور نمود و نمائش کے لئے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرتے رہتے ہیں۔''مٹھائی'' میں ایسے ہی بھیانک چہروں سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔معاشرے کے مسائل کی روداد''مسکراہٹ'' میں ہے۔جس میں سیاستدانوں کا مکروہ چہرہ اور کارگزاریاں بےنقاب کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں شامل ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں میں معاشرہ میں بکھرے مسائل کی روداد ہے۔بہت سادہ اور عام فہم زبان لیکن بعض مقامات پر زبان کی لطافت، گہرائی اور گیرائی کی تلاش میں قاری تشنگی کا شکار ہونے لگتا ہے تاہم ابتدائی کوشش میں اُمید کی بہت سی کرنیں موجود ہیں۔

آتش زیرِ پا رکھنے والا تخلیق کار

محمد بشیر رانجھا

جاوید شاہین کا ایک مقطع ہے:

بات جو دِل میں ہے کھل کر اُسے کہہ دے شاہیںؔ
کیا خبر کل کو یہ آشفتہ بیانی نہ رہے

''مجھے روشنی چاہیئے''......ساجد خان کے افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل اس کا اوّلین مجموعہ ہے۔ساجد خان ہمارے عہد کا ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو روایت شکن بھی اور روایت ساز بھی۔ وہ اظہار اور موضوعات کی ترسیل کے معاملے میں ''گائیڈڈ میزائل'' کا ہمسفر نہیں۔اس کا فکری بہاؤ اور جذباتی تحرک متعین منزل پر پہنچنے کے بجائے تخیل اور تجربے کے کھلے میدانوں میں صحرائی ریت کی مانند شش جہت میں پھیلتا نظر آتا ہے۔اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس کا اپنا کوئی ویژن نہیں......وہ ہر شے، واقعے، تجربے، واردات اور معاملے کی تہوں میں اتر کر حقائق اور اصلیتوں سے ایسی صورتیں اجاگر کرتا ہے جنہیں دیکھ کر قاری نتائج اور مقاصد تک از خود پہنچنے کی سبیل ڈھونڈ لیتا ہے۔

ولیم جیمز کہتا ہے کہ ''تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا کیونکہ یہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔یہ ایک وسیع صلاحیت کا احساس ہے......مکڑی کا بہت بڑا جالا ہے......جس کا تانا بانا نہایت مہین اور ریشمی دھاگوں سے بنا ہے۔ یہ جالا انسانی شعور کے کمرے میں پھیلا ہے۔اس کی گرفت میں چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ آجاتا ہے۔اسے شعور کی فضائے محیط کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔اگر شعور زبردست قوتِ تخیّل کا مالک ہے یا کسی نابغے (جینئس) کا شعور ہے تو کوئی شے اس کے دائرے سے خارج نہیں رہتی''۔

ساجد خان کے تجربے کو اسی حوالے سے متعین کیا جاسکتا ہے۔اس کا شعور ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں بلکہ ایک تجرباتی کل سے متعلق ہے۔اس کے شعور کی فضائے محیط نے ان افسانوں کو

مخصوص لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ اس کے افسانوں میں تجربے محض تجربے نہیں رہتے کہ وہ اپنے وجودی نکھار سے بے نیاز ہو جائیں اور اپنے جذبوں بھرے شعوری رویوں کا اظہار بھی نہ کر سکیں۔ اس کے تجربے اس کی عملی زندگی کے خمیر سے تیار ہوئے ہیں۔

ساجد خان کا فن نہ تو جذبات وافکار کی پیچیدہ اکائیوں سے مرتب ہونے والا کوئی حل شدہ ریاضیاتی فارمولا ہے، نہ ہی کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے گِٹ تھرو گائیڈ اور نہ ہی اس کا تعلق کسی دائیں بائیں کی منشوریاتی راہ عمل سے ہے۔ ساجد خان اپنے بہت سے ہم عصر افسانہ نویسوں کی مانند سستی جذباتیت، نرم وملائم اظہاریت، جنسی نشاطیت اور جسمانی مقناطیسیت کے حربوں سے کام لینے کو معیوب جانتا ہے اور سستی شہرت حاصل کر کے ٹیبل ٹاک بننا اس کا مسئلہ ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس وہ اپنے گردوپیش کے حالات کی عذاب آفرینیوں میں فرد کی بے حسی اور اپنے خول میں سمٹ جانے کے عمل پر احتجاج کرتا ہے۔ وہ کچلی روحوں اور بے بس نسلوں کو زندگی کے حقیقی معانی جاننے کی اہمیت پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔

ساجد خان کارزارِ حیات میں دوستی اور دشمنی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہے اور سماج میں زندگی کی میکانکیت اور یکسانیت سے نالاں بھی ہے۔ جذبوں کی نارسائی کا اُسے شدید قلق ہے۔ اسے یہ جذبے آنکھ کنارے ٹوٹی پتنگ کی مانند نظر آتے ہیں۔ آس اور اُمید دِلاتے لمحے اسے پریشان کرتے ہیں۔ تجارتی رشتوں کے سماج میں اُسے اپنا وجود اُس بوسیدہ کپڑے کی صورت نظر آتا ہے جسے نہ پہنا جا سکتا ہے اور نہ ہی سنبھال کر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے شہرِ محبت میں ایسے کوڑھ زدہ وجودوں کی بہتات ہے جن کا علاج محبت کی بارش کے سوا کچھ نہیں۔ بے یقینی اور نا اُمیدی کی تاریک دلدلوں میں ڈوبتے ضمیر ساجد خان کو ہانٹ کرتے ہیں اور وہ چیخ اٹھتا ہے۔ اسے بولتی زبانوں پر سنہری تالے نظر آتے ہیں اور اُسے ہر سماجی قدر میں سرمائے کی سکاچ ٹیپ کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ وہ ''حقِ ملکیت'' جتانے کے خلاف ہے...... ہر نوع کی حقِ ملکیت کے خلاف......وہ دولت، محبت اور عقیدت کی مساویانہ تقسیم کا علمبردار ہے اور محبت میں بغاوت اور احتجاج کو اپنا

بنیادی حق سمجھتا ہے۔

آزادی ساجد خان کے وجود کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کا کہنا ہے کہ آزادی سرمائے سے سلب ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے انسانوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے لیکن اس کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے اس لئے وہ آزاد ہے۔ جب وہ اپنے گردوپیش میں معصوم انسانیت کی پناہ گاہوں کی کے بجائے جبری مشقت اور چائلڈ لیبر کے ایسے اڈے موجود پاتا ہے جہاں معصوم بچوں سے ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی قربانی لے کر جانوروں کی طرح دن رات مشقت کرائی جاتی ہے تو اسے سماج کے ایسے طبقات سے نفرت ہونے لگتی ہے جو ان ننھے فرشتوں کی تکالیف کا باعث ہیں......ایسے ماحول میں اس کا جی متلانے لگتا ہے۔

ساجد خان کی کہانیوں اور افسانوں میں وجودی رشتوں کی بھرپور شکلیں اجاگر ہوئی ہیں۔ ابلاغ، آزادی، وابستگی، موت اور زندگی کی جدلیات، بے معنویت، ذہنوں کا بنجر پن، احتجاج، مزاحمت، محبت، وجود اور سیاست، وجود اور معاشرت، وجود اور وجود کی آویزش، اداسیاں، بے ہنگم کام، بے آس تنہائیاں، انسان اور انسانی رشتوں کے مابین فاصلے، بھوک، ناداری، غربت، جرم وسزا، عدم وصال، روحوں کا نیلام، اجنبیت، جلاوطنی اور اس کا عذاب، افیونی قدریں، سردمہریاں، سجے اور آراستہ وجودوں کی طراریاں اور بربادیاں، خودشناسی، خواب اور حقیقت کا اِتصال، ڈر، دہشت گردی، لاشیں اور انسانی آرزوؤں کی تاراجی اور اس قسم کے دیگر لاتعداد تاثرات، تلازمات اور موضوعات اس کے افسانوں کی بنت میں شامل ہیں۔

ساجد خان چونکہ افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہے اس لئے اس تحریروں میں ''قلم کارواں حویلیاں'' کے شعراء کی دوستی اور ان کے ساتھ نشت و برخاست کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں......جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی کہانیوں کے پس منظر میں ن م راشد کی سی روایت شکنی بھی ہے اور افتخار جالب کی لسانی توڑ پھوڑ بھی......میراجی کا سادہ اور اتھاہ گہرائیوں سے معمور اسلوب بھی ہے اور مجید امجد کی جزئیات نگاری بھی......لیکن اس سب کے

باوجود اس نے اپنا ایک منفرد رنگ بھی جمانے کی کوشش کی ہے۔ سیدھے سپاٹ لہجے میں بات کر جانے کی تکنیک میں اس کی ذات اور شعور کا بھرپور اظہار اس کی مہارتوں کا نقیب ہے۔

جدید فلسفیوں اور خاص طور پر وجودیت اور تصوف کے مطالعے نے ساجد خان کے شعور کو نئی جہتیں عطا کی ہیں اور اسے اپنے جذبے اور شعور سے مکمل طور پر آگاہی ہے......اس کے افسانوں اور کہانیوں کا نفسیاتی اور حسی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسلوب کی برجستگی اور بے تکلفی کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس کی توجہ نہ تو صناعی کی جانب ہے اور نہ ہی اسلوب کے بناؤ سنوار کی جانب......لفظوں کی نشست و برخاست کا ریاضت طلب معاملہ اس کے لئے اہم نہیں...... وہ خیال اور جذبے کے بہاؤ میں بہتا ہے اور ہر نوع کے الفاظ میں اپنے مفاہیم کو منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہندکو، انگریزی، پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ اردو اسلوب اور روائتی آہنگ میں استعمال کرنا اس کے لئے ممنوعہ نہیں ہے۔

ساجد خان متوسط طبقے کا پڑھا لکھا باشعور نوجوان ہے۔ وہ نئی نسل کا بظاہر دھیما لہجہ رکھنے والا آتش زیرِ پا تخلیق کار ہے۔ اس زیرِ پا آتش کا مرکز اس کا تندور کی مانند دہکتا قلب ہے۔ اس آگ کو ہوا دینے کا کام اس کے دماغ کے ذمے ہے۔ ساجد خان کی کہانیاں ایسی خود کلامی ہیں جس میں ہمکلامی اور خارجی آوازیں بھی شامل ہیں۔ اس کے لفظوں میں اس کے احتجاجی لہو کا پارا بھرا ہوا ہے اور اس کے افسانوں میں جبر کی بستیوں کو خاکستر کر دینے والا لاوا بھی ہے۔ اس کے متخیلہ کے جال میں وہ سب گندی مچھلیاں گرفتار ہوئی ہیں جنھوں نے زندگی کے شفاف اور خوبصورت تالاب کو خراب کر رکھا ہے۔

ساجد خان کے افسانے اس کے سچے اور حقیقی تجربوں سے کشید ہوئے ہیں۔ اس کی کہانیاں اور افسانے نہ تو لذتِ وصال سے بھرپور ہیں اور نہ ہی کربِ ہجر کی لایعنی داستانیں...... اور اس کے افسانوں میں سماجی سمجھوتہ بازی اور کچی رومانویت کے عناصر بھی دستیاب نہیں ہیں۔ وہ جس قسم کے ماحول میں رہا، جیسی اس کو دوستوں کی محفلیں میسر آئیں، گردوپیش میں جس صورت

حال سے واسطہ پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے شعور کی باطنی آنکھ نے اس کے گرد و پیش کے تجربوں کو جس کینوس پر ترتیب دیا اس کی کتاب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ساجد خان نے زندگی کے تجربات کو جس خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنے افسانوں اور کہانیوں میں سمیٹا ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مجھے یہ پیشنگوئی کرنے میں کوئی باق نہیں کہ مستقبل قریب میں اسے اپنے فکری وفنی اسلوب، اظہار اور ڈکشن کی وجہ سے ایک منفرد اور واضح شناخت بنانے میں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

سلگتے اَلمیے

محمد اسفر آفاقیؔ

غمِ ہستی کی زنجیروں سے انساں کو کہاں فرصت
کہیں حالات ظالم ہیں کہیں تدبیر ظالم ہے

آج کا انسان حالات کے دھارے پر تنکوں کی طرح بہے جا رہا ہے۔ یہ ایک واشگاف حقیقت ہے کہ انقلابِ زمانہ کی ستم ظریفیوں سے کوئی بھی فرد نہیں بچ پاتا۔ کائنات کے سبھی رنگ انسانی حسیات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ رنگ کبھی چھلکتے آنسوؤں میں جھلکتے ہیں اور کبھی سسکیوں اور آہوں میں مچلتے ہیں۔ زندگی کا کارواں کہیں رُکتا نہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور نئی دُنیا کے ساتھ نئے حالات اور نقشے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ انسانی المیوں کے وقوع پذیر ہونے کے عمل اور عہد میں ہی کہیں ہمارے آس پاس ایک ایسا تخلیق کار بھی ہوتا ہے جو ان تمام المیوں کو اپنے دِل پہ سہتا جاتا ہے اور پھر انہی المیوں اور رویوں کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعے باقی کے تمام انسانوں کو دکھاتا ہے۔ ایسے تخلیق کار کو عرفِ عام میں ہم افسانہ نویس یا کہانی کار کہتے ہیں۔ ساجد خان بھی اسی صف کا ایک جینوئن تخلیق کار ہے۔ جو ایک مختصر عرصے میں بطور افسانہ نویس اور کہانی کار اپنی شناخت اور مقام بنا چکا ہے۔ ساجد خان کے مشاہدے کی حس عام لوگوں کی بہ نسبت بہت تیز اور عمیق ہے۔ جو اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے اور جس زاویے سے دیکھتا ہے وہ اسے اپنے قارئین کے سامنے اسی انداز اور زاویے سے پیش کر دیتا ہے...... اور اس کوشش

میں وہ کامیاب بھی نظر آتا ہے۔کوئی منظر یا واقعہ جب اس کے ذہن کے کینوس پر اترتا ہے تو وہ اسے ردِ عمل کے طور پر کہانی یا افسانے کے روپ میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل چند لمحوں پر بھی محیط ہوسکتا ہے اور اس میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ساجد خان نے اس معاملے میں بھی زرخیزی پائی ہے۔ وہ پوری کائنات کے غموں کی شدت کو اپنے اندر محسوس کرنے والا تخلیق کار ہے۔

ساجد خان نے اپنے افسانوں اور کہانیوں میں تمام انسانی رویوں اور ان کی باریکیوں کو منظرِ عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے افسانوں اور کہانیوں کے پلاٹ بناوٹ یا تصنع سے بالکل پاک صاف نظر آتے ہیں۔اس نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی بھی ناقابلِ فہم یا دور از کار بات کا سہارا نہیں لیا۔ ہر افسانے اور کہانی میں کسی المیے کی طرف اشارہ ہے۔مبالغے سے پرہیز اس کی کہانی اور افسانے کا خاصہ ہے۔ساجد خان کی کہانی یا افسانہ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ساجد خان کہانی یا افسانے کے کردار ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک ہیں۔ساجد خان کی مشاہدے اور تجزیے کی حس نے اس کی تحریر کو رواں، شگفتہ اور متحرک بنا دیا ہے۔اس کتاب میں شامل افسانوں میں ساجد خان نے اپنے عہد کے سلگتے المیوں پر قلم اٹھایا ہے۔

ساجد خان کی اس کتاب میں شامل سبھی کہانیاں اپنے پلاٹ، کرداروں اور موضوعات کے حوالے سے انتہائی مضبوط اور جاندار ہیں......ساجد خان کے اسلوب اور طرز تحریر کا جامع تأثر تو پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہی مکمل ہوتا ہے تاہم میں یہاں پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر کتاب میں شامل تمام افسانوں اور کہانیوں کا تین چار سطری عمومی تجزیہ پیش کرتا ہوں۔

دولت کی ریل پیل نے انسانی زندگی کے تمدن کو گہنا دیا ہے......ضروریاتِ زندگی کو اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ ان کے حصول کے لئے حقیقی رشتوں کی پہچان تک سے انسان منحرف ہو گیا ہے۔آخری اڑان میں یہی موضوع زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

''آ کاش'' افسانے میں دیہاتی کلچر اور محرومیوں کو زیرَ بحث لا کر یہ باور کرایا کہ غربت زدہ معاشرے میں بعض گھروں کے حالات، بچوں کی تعلیم پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ایسے میں بھی

حکومتی نیرو چین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں۔حالیہ دہشت گردی کی کوکھ سے پھوٹنے والی کہانی ''سومی'' میں ساجد خان نے پہلے اُمید کی تجسیم کی ور پھر ایک زوردار دھماکے نے خواب کو تعبیر کے آس پاس ہی کہیں چکنا چور کر دیا۔

اولاد کے لئے ماں باپ کیا کچھ نہیں کرتے۔اپنی جائز ضرورتوں اور خواہشات کو بھی اپنی اولاد کی ضرورتوں اور خواہشات پر قربان کر دیتے ہیں۔خوش قسمت ہیں وہ والدین جن کی اولاد ترقی اور تربیت کے اُس معیار تک پہنچ جاتے ہیں جہاں اولاد کو دیکھ کر انہیں سکون نصیب ہوتا ہے۔''اثاثہ'' اسی موضوع پر لکھا گیا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔

''اُس پار'' افسانے میں تقسیم کے بعد درپیش مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے......نظریاتی سرحدوں کے علاوہ جغرافیائی سرحدوں کی تقسیم اور پاک بھارت تعلقات میں بدستور کشیدگی کے بطن سے جنم لینے والی اس کہانی میں دو خاندانوں اور ان کی اولادوں تک اِس تقسیم کے اثرات کو منتقل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ناجائز طریقوں سے سماجی تعلقات میں اضافے، اعلیٰ سوسائٹی میں اثر و رسوخ بڑھانے اور حق داروں کا حق مار کر ترقی کرنے کے رُجحان میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔اس دوڑ میں شامل لوگوں کے پاس رشوت اور سفارش کے علاوہ جنس کے حربہ کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔افسانہ ''انقلاب'' اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔بیٹی جیسے مقدس رشتے کی مٹھاس اور پھر اس کی جدائی ماں باپ کے لئے موت سے کم نہیں ہوتی۔''بیٹی'' افسانے میں مصنف نے بہت خوبصورتی سے جہاں والدین اور بیٹیوں کے مابین جذباتی وابستگی کو پیش کیا ہے وہاں اولادِ نرینہ سے محرومی میں مشیتِ ایزدی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں ابنارمل لوگوں کے مسائل پر سماجی حلقوں میں اجتماعی طور پر خاص توجہ نہیں دی جاتی......ایسے لوگ اسی خاندان کا مسئلہ رہتے ہیں جس میں وہ جنم لیتے ہے......بعض بے حس اور مجبور خاندانوں میں بھی رویوں میں تبدیلی اور ایسے افراد پر خاص توجہ نہ دینے کی وجہ سے ایسے افراد

گلیوں، بازاروں اور درگاہوں کے آس پاس دھکے کھاتے ہوئے ملتے ہیں...... جو ہمارے عمومی اور اجتماعی روّیوں پر تھپڑ کی صورت ہماری آنکھوں میں چبھتے رہتے ہیں......حکومتی سطح پر بھی ایسے لوگوں کی فلاح و بہبود پر بننے والے اداروں کی کارکردگی صفر ہے......اسی موضوع پر ساجد خان نے ایک ''پاگل'' کی کہانی لکھ کر اپنے اندر ہماری اجتماعی سماجی بے حسی کی نشاندہی کی ہے۔

ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ عزتیں نیلام ہوتی ہیں اور آئے دن عزتوں کا بیوپار ہوتا ہے......لیکن اسی ماحول میں رہنے والے بعض کردار ایسے بھی ہیں جو اپنی عزت و آبرو کے بدلے سب کچھ دان کر کے اسے بچا لیتے ہیں۔''پانچ کا پینتالیس'' افسانے میں گلی گلی پھرنے والی ایک عورت کی کہانی پیش کی گئی ہے جس میں وہ اپنی عزت و آبرو بچانے کی غرض سے اپنے پورے دن کی کمائی ایک اوباش کو دے کر جان بخشی کرواتی ہے۔

''کتے'' کی علامت کو افسانہ نگار نے موجودہ عہد کی نام نہاد ترقی پسندی اور اس کے بطن سے جنم لینے والی معاشرتی آلودگیوں کی نقاب کشائی کے لئے استعمال کیا ہے۔تنہائی بذاتِ خود ایک المیہ ہے......تاہم تنہا انسان جب پوری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر کچھ سوچتا ہے تو اس کا اندازِ تفکر منفرد ہوتا ہے......اپنی ذات میں تنہا انسان کی کہانی کو افسانہ ''تنہائی'' میں انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

حکومت اور بیوروکریسی کے درمیان پستی ہوئی عوام بالخصوص ہماری نوجوان نسل جس کرب کا شکار ہے اس کی داستانیں ہم آئے روز میڈیا کے ذریعے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔افسانہ ''جب ان کا جی چاہے گا'' میں اسی کرب اور استحصال کی نشاندہی کی گئی ہے۔

بچوں سے مشقت لینے اور بچوں کے بنیادی حقوق کے استحصال کے حوالے سے کتاب میں ایک مضبوط افسانہ ''چھوٹے'' کے عنوان سے شامل ہے۔اس افسانے میں مصنف نے بچوں کے اُس دکھ اور کرب کو اپنے دل پر سہا ہے جو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے کھلونوں کے بجائے ہمارے معاشرے میں جبری مشقت اور بنیادی حقوق کے استحصال کا شکار ہو کر اٹھاتے ہیں۔

''خدمتِ خلق'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں نام نہاد مسیحاؤں کی رعونت کو انتہائی مہارت

سے پیش کیا گیا ہے۔ جوڈگری کے حصول سے پہلے تو خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشاری کا ڈھنڈورہ پیٹتے نہیں تھکتے اورڈگری مل جانے کے بعداس جذبے کو محض دکھاوے اور دولت کے حصول کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ہر ایک اپنے فلسفے ،تھیوری اوراپنے نظریات کو دوسروں پر بزور ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ہماری تہذیب کا سب سے بڑاالمیہ یہی ہے۔موجودہ تہذیب خوداپنے خنجر سے خودکشی پر آمادہ نظر آتی ہے۔دنیا آج ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔سب سے تشویشناک بات یہ بھی ہے کہ دنیامیں شرح خواندگی کا تناسب جس تیزی سے بڑھ رہا ہے اتنی ہی تیز رفتاری سے بدامنی میں بھی اضافہ ہورہا ہے......''خون'' بھی ایک ایساہی افسانہ ہے جس میں اس المیے کوانتہائی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔

انسان کی محرومیوں میں سب سے بڑی محرومی بےاولادی ہےاور کبھی کبھی تو یہ ایک طعنہ بن جاتی ہے لیکن کہیں ایسا بھی ہے کہ اولاد ہوتے ہوئے بھی انسان خواہشات کی دہلیز پار نہیں کرسکتا۔ افسانہ نگار نے اس حقیقت کوایک خوبصورت کہانی ''زیست کا قرض''میں سمویا ہے۔

ایک تخلیق کار کے لئے روحانیت شناسی کس قدر ضروری ہےاس کا اندازہ ساجد خان کے نفسیاتی حسیات کے متعلق ایک اورخوبصورت علامتی افسانہ ''سائے'' پڑھ کر ہوتا ہے۔یہ افسانہ ساجد خان کی روحانیت شناسی کا بھی غماز ہے۔انسانی اقداراور رویوں کے زوال اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے متعلق تخلیق کیا گیاافسانہ'' سبکدوش'' پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری بذاتِ خوداس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔حق آیااور باطل مٹ گیا...... کیونکہ باطل کومٹنا ہی تھا......'' گھروندہ'' مٹی سے بنے انسانوں اوران کی خواہشات کی کہانی ہے۔ یہ افسانہ پائیداری سے ناپائیداری کا سفر ہے۔اس افسانے میں مصنف نے اس جہانِ رنگ و بو کے دلدادہ اوراس جہانِ فانی کے محبان کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے۔موبائل فون بیک وقت رحمت اور زحمت کے زمرے میں آتا ہے۔اس کے فوائداور نقصانات کا انحصاراس کے استعمال پر ہے۔افسانہ'وبالِ جان' کا پلاٹ بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔افسانہ نگار نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کے نقصانات بیان کئے ہیں اور یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ مصنف کو

اس کے لئے ایک کہانی کا سہارا لینا پڑا۔

سیاسی دنیا کی بازی گری کے ثمرات سے کون واقف نہیں......عوام کی ملی بھگت اور آشیر باد کے ساتھ سیاست میں منافقت کے در آنے سے جو مسائل اور قباحتیں ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں ان کا بڑی خوبصورتی سے افسانہ ''مٹھائی'' میں پردہ چاک کیا گیا ہے۔اس میں شعوری طور پر عوام کو سیاست کے کھیل اور اس کے در پردہ مقاصد سے آگاہی دلائی گئی ہے۔

''مجھے روشنی چاہئیے'' افسانہ کتاب کا مرکزی اور اہم افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنف نے اس روشنی کی خواہش کی ہے جس کی ہر ایک کو ضرورت ہے۔یہ روشنی ہمیں مذہب، عقیدے اور اعمال پر سختی سے کار بند رہ کر اسی دنیا میں حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے......اچھے سماجی تعلقات اور نیک اعمال کی بدولت روشنی کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

سماج کے ہاتھوں عورت کے استحصال کی بدولت موجودہ عہد میں اس صنفِ نازک پر انتہائی برا وقت آیا ہوا ہے جو ہماری اجتماعی معاشرتی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''مسکراہٹ'' میں مصنف نے عورت کی سماجی حیثیت اور موجودہ عہد میں اس منصب اور رشتے کی بے توقیری کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

توہم پرستی اور اعتقاد کی کمزوری ہمارے معاشرے کا ایک بھیانک اور انتہائی مکروہ المیہ ہے۔توہم پرستی کا شکار انسان ہمیشہ دھوکے اور فریب کا شکار رہتا ہے۔عقیدے کی کمزوری کی بدولت بے شمار انسان دھوکا باز لوگوں کے چنگل میں آکر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔اسی موضوع پر ساجد خان نے ایک خوبصورت افسانہ ''نشانی'' تخلیق کیا ہے جس میں دھوکہ بازوں کے ساتھ بعض حکومتی اہلکاروں کی ملی بھگت کو بھی دکھایا گیا ہے۔

نیند کا سفر دراصل ابدی نیند کی طرف بڑھتا ہے۔موت کے بعد انسان کو نیند کی حاجت نہیں رہتی......ساجد خان نے عصرِ حاضر کی بے اطمینانی اور بے سکونی کے شکار ایک انسان کو نیند کی تلاش میں سرگرداں دیکھا ہے......اس افسانے میں ساجد خان نے اس کردار کو احمد فراز کے اس شعر کی عملی تفسیر بنا

کر پیش کیا ہے:

نیند تو کیا آئے گی فرازؔ
موت آئی تو سو لیں گے

....

قارئینِ محترم! یہی میرے الفاظ کہانی کہنے کا جواز ہیں......میرے سامنے کہانی جس پیکر اور صورت میں آتی ہے میں اسے اسی شکل اور صورت میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں......میں کہانی کو اس کے اصلی پیکر میں کس حد تک ڈھالنے میں کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ کریں گے......میری اس بارے میں رائے کسی بھی لحاظ سے معتبر نہیں ہو سکتی۔

ساجد خان......حویلیاں

آخری اُڑان

تین کمروں پر مشتمل چھوٹے سے گھر میں داخل ہوتے ہی خلیل احمد نے اپنی بیوی کو آواز دی......کہاں ہو......؟ صحن کے ایک جانب چار دیواری سے ملحقہ ایک کونے میں رکھے لوہے کے بڑے سے پنجرے میں بند کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کی آوازیں نکال رہے تھے......دو کبوتر آپس میں پر لڑا رہے تھے...... لکّا پنجرے سے نکلنے کے لیے بے تاب تھا......سفید رنگت اور سرخ آنکھوں والا یہ کبوتر سارے کبوتروں سے اونچی اُڑان بھرتا۔

خلیل احمد گاؤں متوسط لوگوں میں شامل تھا سارا گاؤں اُسے خلیل ماما کہہ کے پکارتا تھا......بیس کنال اراضی تھی جو اس کے بال بچوں کا پیٹ پالنے سے قاصر تھی۔ وہ کثیر العیال آدمی تھا۔ خلیل ماما کے بڑے بیٹے کے بعد تین بیٹیاں کلثوم، فہمیدہ اور رابعہ اور دو چھوٹے بیٹے علی اور فیضان تھے۔ پورے کنبے کی کفالت اور اخراجات کا بوجھ آہستہ آہستہ اُس کی استطاعت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ معاشی بدحالی اور وسائل کی تنگی کی بدولت گھر میں بعض اوقات چخ چخ بھی رہنے لگی......وہ اپنے بڑے بیٹے وسیم کو فوج میں بھرتی ہونے پہ مجبور کرتا مگر وہ کسی طور بھی فوج میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ خلیل احمد نے کئی بار اُسے پیار محبت اور کبھی کبھار غصے سے بھی سمجھایا کہ اُس کے کئی یار دوست اور گاؤں کے کچھ اور لڑکے بھی بھرتی ہو چکے ہیں مگر وسیم بضد تھا کہ وہ بی اے ضرور کرے گا۔ خلیل احمد کے چھوٹے بچے گاؤں کے سرکاری اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ بارہا وسیم سے کہہ چکا تھا کہ وہ اب اُسے مزید نہیں پڑھا سکتا۔

وہ جب بھی کھیتوں سے واپس لوٹتا تو کسی نہ کسی بات پر بڑے بیٹے کو ضرور کوستا......اس کی بیوی رشیدہ بیگم خاوند سے اُلجھ جاتی......بعض اوقات نوک جھونک اتنا بڑھ جاتی کہ ان کی آواز

گلی میں بھی سنی جاتی......

''یہ کیا کرے گا بتائے تو......؟''خلیل احمد چیختے ہوئے بولا......

''کچھ نہ کچھ کر لے گا...... ہر وقت بے عزت نہ کیا کرو......'' رشیدہ بیگم نے بیٹے کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

وسیم ایف اے کے بعد ایک سال تک پرائیوٹ طور پر بی اے کی تیاری میں جتا رہا...... دوستوں سے کتابیں مانگ مانگ کر لاتا...... جب کبھی ابّا معمول سے زیادہ سنانا شروع کرتے تو وہ خود کو بُرا بھلا کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتا اور سورج ڈھلنے کے بعد ہی گھر واپس آتا۔

آج پھر خلیل احمد بے حد غصے میں تھا جونہی وسیم گھر میں داخل ہوا......خلیل احمد نے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا......اور نجانے کیوں......آج پہلی بار وسیم بھی باپ سے اُلجھ بیٹھا۔

''نکل جاؤ اس گھر سے''......خلیل احمد چلایا

''چلا جاؤں گا......'' بیٹا بولا......

''غیرت ہے تو ابھی اسی وقت دفعان ہو جا''۔خلیل احمد چیختے ہوئے بولا۔

اور وسیم ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں دور پھینکتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

سامنے والے کمرے میں وسیم کی ماں باپ بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے......وہ فوراً بیٹے کے پیچھے بھاگی......مگر وہ تو کہیں دور جا چکا تھا۔

چھوٹی بہنیں اور بھائی جو کھیل کود چھوڑ کر گھر کے ایک کونے میں سہمے ہوئے کھڑے تھے......کافی دیر تک گم سم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے......اور جب ماں واپس لوٹی تو وہ بھی اس کے پیچھے باورچی خانے میں جا کر کھسر پھسر کرنے لگے۔

رات کافی گزر چکی اور وسیم کی دور دور تک کوئی خبر نہ تھی......اس کی ماں اور بہنوں کو پریشانی ہونے لگی۔

''جائیں......جا کر دیکھیں......کہاں گیا ہے؟''......رشیدہ بیگم نے آخر کار خلیل احمد

کومخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دفع کرو نکمے کو...... جہاں بھی ہوگا آ جائے گا''............خلیل احمد نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

رات گئے بھی جب وسیم واپس نہ لوٹا تو رشیدہ بیگم قدرے پریشانی سے خلیل احمد سے کہنے لگیں......''جا کے پتا تو کریں؟ وسیم ابھی تک نہیں لوٹا......''

''کیا پتا کروں؟ سو جاؤ...... آ جائے گا...... تیرا پڑھا کو جنٹلمین!......''،خلیل احمد ناگواری سے کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

رشیدہ بیگم کے دل میں وسوسے اٹھنے لگے کچھ توقف کے بعد پھر بولی۔

''جائیں کہیں سے ڈھونڈ کے لائیں......''

مگر خلیل احمد ٹس سے مس نہ ہوا۔

رشیدہ بیگم اور اسکی بیٹیوں کلثوم،فہمیدہ اور رابعہ نے رات آنکھوں میں کاٹ دی جبکہ علی اور فیضان سو گئے تھے......

خلیل احمد کی جب آنکھ کھلی تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔وسیم کو گھر میں نہ پا کر وہ بھی کچھ فکرمند ہوا۔سب سے پہلے مسجد میں جا کر دیکھا......پھر اِدھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھا...... اُس کے دوستوں کے گھروں سے بھی ہو آیا لیکن کچھ خبر نہ ملی......

دوسری صبح علی اور فیضان بڑے بھائی کے کبوتروں کو اُڑانے میں مصروف ہو گئے۔ان میں ایک کبوتر بہت اونچی اُڑان اُڑتا تھا...... باقی چھوٹے چھوٹے چکر لگاتے۔کچھ گھر کی منڈیر پر آ کر بیٹھ جاتے......مگر سفید رنگت اور سرخ آنکھوں والا کبوتر جب ہوا میں جاتا تو اتنا اونچا اُڑتا کہ کافی دیر تک آسمان پہ ٹکٹکی باندھنے کے بعد ہی اُسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔آج جب وہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا تو اچانک ایک طوفانی ہوا کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی......علی پریشان ہو گیا کہ بڑا بھائی پوچھے گا تو وہ کیا بتائے گا؟

فیضان نے موسم کے تیور دیکھے تو بولا ''علی بھائی! چلو جلدی کرو......کبوتروں کو پنجرے میں بند کرتے ہیں''۔

انہوں نے سب کبوتروں کو جلدی جلدی بند کیا اور طوفان سے بچنے کے لئے بھاگ کر کمرے میں جا دبکے......مگر سب سے اونچی اُڑان بھرنے والا سفید کبوتر زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے شاید طوفان کی نذر ہو گیا۔اس کے بعد اُس کبوتر کا کچھ پتا نہ چلا۔

....

جہاز ایئر پورٹ پر اُتر چکا تھا۔بے شمار مسافروں میں بہت سے اپنے وطن کی مٹی چومنے کو بے تاب تھے اور انہی میں ایک وسیم بھی تھا جو پندرہ برس بعد لوٹا تھا۔ایئر پورٹ کے باہر اپنے پیاروں کو لینے کے لئے آنیوالوں کا بھی ایک جمِ غفیر تھا لیکن وسیم کے استقبال کے لیے کوئی موجود نہ تھا......اس نے اس جمِ غفیر سے نکل کر اپنے دائیں بائیں ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ٹیکسی اسٹینڈ سے ایک گاڑی لی اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑی گاؤں کی جانب محوِ سفر تھی ۔ وسیم کو اپنے اندر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہونے لگا۔اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پندرہ سال قید با مشقت کاٹ کر لوٹ رہا ہے......ڈرائیور سے بھی اُسے ایک طرح کی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی......مگر ڈرائیور شاید بور شخصیت کا حامل تھا......وسیم ڈھیروں باتیں کرنے کے موڈ میں تھا اور ڈرائیور جلد از جلد منزل پہ پہنچنے کی سعی کر رہا تھا۔

''ہمارے ملک کا شمار دُنیا کے حسین ترین ملکوں میں ہوتا ہے......دنیا بھر کی نعمتیں، دریا، آبشاریں، صاف پانی کے قدرتی چشمے......کھیت، میدان، میلوں لمبے صحرا، فلک بوس پہاڑ اور برف پوش وادیاں ......کیا نہیں ہمارے ملک میں......جنگل، سبزے، موسم، پھل ، زرعی اجناس اور معدنی ذخائر کی دولت سے مالا مال ہے ہمارا ملک'' ......وسیم گویا ہوا۔

ڈرائیور نے قدرے ناگواری سے وسیم کی جانب دیکھا......ڈرائیور کی آنکھوں میں کئی

سوال تھے......وسیم اس کا موڈ دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

وسیم کھیتوں، پہاڑوں اور سبزے سے لطف اندوز ہو رہا تھا......گاڑی تیزی سے دھول اُڑاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی...... جب گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو گویا اس کی ساری تھکاوٹ رفو ہو گئی۔ وسیم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے وجود میں عجیب سی سرشاری سرایت کر گئی...... اس نے گھر سے قدرے دور اُتر کر ڈرائیور کو فارغ کر دیا......ڈرائیور نے رقم لی اور چلتا بنا......وسیم نے دونوں بیگ اپنے شانوں سے لٹکائے اور ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے گھر کی جانب چلنے لگا۔

گاؤں میں کافی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں......کچی سڑک پختہ تھی......چھوٹی چھوٹی ٹوٹی پھوٹی گلیاں کسی قدر مضبوط اور کئی نئے گھر بن چکے تھے۔گاؤں کے چاروں جانب سرسبز درخت اپنی شادابی سے لہرا رہے تھے......ناشپاتی، اخروٹ، خوبانی اور سیب کے وسیع باغات اپنے جوبن پر تھے۔ دوسری جانب کیکر، چیڑ اور شہتوت کے درختوں کی بہتات تھی......راستے میں وہ چشمہ بھی آیا جہاں سے سارا گاؤں پانی بھرا کرتا تھا......چشمہ تو اپنی پرانی روانی سے جاری تھا مگر پانی بھرنے والوں کی بھیڑ کے بجائے پانی کے پائپ بچھا کر گھروں تک پانی پہنچانے کا بندوبست ہو چکا تھا۔

....

وسیم کے گھر چھوڑنے کے بعد ڈیڑھ دو برس تک عجیب و غریب خبریں پہنچتی رہیں۔کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ......مگر اُس کے بارے میں کسی کو بھی حتمی طور پر کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔سب قیاس آرائیاں اس وقت دم توڑ گئیں جب ایک دن اچانک وسیم کا خط پہنچا۔

شروع کے ڈیڑھ دو سال تک وہ ایک سیٹھ کے مقامی سٹور پر کام کرتا رہا۔ جہاں اس نے سخت محنت اور ایمان داری سے نہ صرف کام کیا بلکہ اخلاقی طور پر سیٹھ کو اتنا متاثر کیا کہ سیٹھ نے اسے اپنے دبئ کے سٹور پر مینیجر کے طور پر بھیج دیا۔ جہاں چار سال تک مالک کو درہم کما کر دیتا رہا۔

مالک اس کی محنت اور دیانت سے بہت خوش ہوا اور اُس نے وسیم کو انگلینڈ اپنے ہوٹل پر بھیج دیا۔

....

پہلے خط سے وسیم کے گھر والوں کو یہ خوشخبری ملی کہ وہ زندہ ہے اور بعد میں روپے، درہم اور پاؤنڈ نے ان کے حالات بھی بدل ڈالے...... روپے کی ریل پیل اور بدلے ہوئے حالات میں خلیل ماما نے اپنی بیٹیوں کو پڑھایا بھی اور ان کے رشتے اچھے خاندانوں میں کر دیئے۔علی اور فیضان نے ایم اے تک تعلیم بھی حاصل کی اور کھاتے پیتے گھرانوں میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔

خلیل ماما نے بیٹے کی کمائی سے نہ صرف بچوں کی کفالت کی بلکہ اس وقت وہ گاؤں میں سب سے زیادہ زرعی اراضی کا مالک بھی تھا......اس وقت گاؤں میں سب سے زیادہ پھل خلیل احمد کی زمینوں سے ہی شہر جاتے......شہر سے آنے والے بڑے بڑے بیوپاری علی اور فیضان کے ہاں ہی ٹھہرتے۔پُرانے گھر کو مسمار کر کے مہمان خانہ بنا دیا گیا تھا جب کہ اُس کے ساتھ ملحقہ زمین خرید کر عالی شان کوٹھی بن چکی تھی...... کچے صحن کی جگہ ماربل نے لے لی تھی۔جدید طرز کی سہولیات سے مزئین باورچی خانہ اور ہال کے ساتھ غسل خانوں کو دیکھ کر انسان متحیر ہو جاتا۔

وسیم کو بھی اپنے گھر کی بدلی ہوئی صورت دیکھ کر حیرت ہونے لگی...... بڑے سے آہنی گیٹ اور وسیع و عریض لان سے گزر کر تین منزلہ کوٹھی تھی۔جس میں وسیم کی والدہ اور اس کے بھائیوں کی بیگمات رہائش پذیر تھیں......وسیم یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔اس کی آمد پہ خاصا ہلا گلا رہا......سب بہنوں کو خبر پہنچائی گئی جو اپنے خاوندوں اور بچوں کے ساتھ آ پہنچیں......مہینہ بھر خوب چہل پہل رہی۔

وسیم کوٹھی کی تیسری منزل پہ کھڑا اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا۔اسے وہ دن ستانے لگے جب وہ کچے گھر میں رہتا تھا۔دو چار دن بعد اپنے کبوتروں کو ہوا میں چھوڑتا اور برآمدے میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر چت لیٹ کر آسمان کی وسعتوں میں اُنہیں ڈھونڈتا......کئی نیچی اڑان بھرنے والے

کبوتر قریبی چھتوں پر جا بیٹھتے اور اُنہیں کنکر مار کے اُڑا تا رہتا......اپنے دوستوں کے ساتھ پہروں خوش گپیوں میں مصروف رہتا......کھیلتا اور گاؤں میں گھوم پھر کر وقت گزارتا تھا۔سب بدل چکا تھا......وسیم نے تہیہ کرلیا کہ اب باقی ماندہ زندگی گاؤں میں ہی گزارے گا......اسے دوبئی کی گرمی بھی یاد آئی اور انگلینڈ کی سرد راتیں بھی......اُسے شروع کے دنوں کے دھکے اور کام سے چُور چُور ہوتے لمحے بھی یاد آئے......زندگی کی آسودگیاں اور آسائشیں بھی یاد آئیں اور ناگوار و جانگسل لمحے بھی۔

وہ خود کلامی کرنے لگا......''ترقی کے پیچھے کتنی تھکاوٹ ہے......جسم چُور چُور اور روح لرز جاتی ہے تب کہیں پیسہ ہاتھ آتا ہے''۔

''وسیم!......بیٹا وسیم......!!'' ماں کی آواز اُسے ماضی سے واپس لے آئی۔

''جی امی جی!......''

''بیٹا! آؤ کھانے پہ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں......''

''آیا امی!''......وہ سیڑھیاں اُترنے لگا

نیچے ہال میں اُس کی بہنیں، بھائی، بھابیاں، والد اور والدہ انتظار کر رہے تھے......وسیم نے سامنے رکھی سبزی اپنی طرف بڑھائی تو کلثوم بولی۔

''وسیم بھائی! آئندہ جب انگلینڈ سے لوٹو گئے تو میرے لیے جدید مووی کیمرہ ضرور لانا......''

وسیم کلثوم کے الفاظ سن کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فہمیدہ بول اٹھی......

''اور میرے لیے موبائل......''

رابعہ نے اپنے خاوند کو کہنی ماری......خاوند اُس کی جانب متوجہ ہونے کو ہی تھا کہ وہ کہنے لگی۔

''وسیم بھائی! جو دُوربین آپ نے دی ہے یہ مجھے پسند نہیں۔آئندہ نئی ضرور لانا''۔

بھاوج بولی۔

''وسیم بھائی! میں تو کوئی فرمائش نہیں کرتی...... جتنا اِس بار لائے ہو اِتنا ہی لے آنا ......میرے لئے کافی ہوگا''۔

سب ہنس پڑے۔

علی اور فیضان کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وسیم نے سامنے بیٹھی والدہ سے پوچھا۔

''امی جی! آپ کے لیے......''

ماں نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! کچھ نہیں چاہیے! بس اب کی بار پندرہ سالوں کی بجائے سال دو سال بعد آ جانا''۔

وسیم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور تیزی سے واش روم کی راہ لی...... جہاں وہ کافی دیر تک تنہائی سے گلے مل کر روتا رہا...... وہ جب واش روم سے باہر آیا تو اُس کی آنکھیں سرخ اور رنگ لٹّے کبوتر کی طرح بظاہر بالکل صاف تھا لیکن اس کے اندر کہیں وہ طوفان بھی برپا تھا جو آخری اُڑان کا پیش خیمہ بنا۔

آکاش

اُس دن کلاس کے تینتالیس طلباء میں سے گیارہ غیر حاضر تھے۔ غیر حاضر طلباء کی قطار بنائی گئی تو سب سے زیادہ غیر حاضر طلباء اسی کلاس میں سے تھے۔ ماسٹر صاحب کمرہ میں داخل ہوئے اور پوری کلاس پر طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولے ''غیر حاضر طلباء کھڑے ہو جائیں اور غیر حاضری کی وجہ بتائیں''۔

سب سے پہلے عامر اُٹھا۔ اس کا شمار درمیانے درجے کے طلباء میں ہوتا تھا۔ وہ خاصا سلجھا ہوا طالب علم تھا مگر آج کچھ اُلجھا اُلجھا دکھائی دے رہا تھا۔

''مجھے بخار تھا''......اُس نے وجہ بیان کی۔

''دوائی لی تھی......؟''ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

''جی جناب! خالہ کے گھر سے امی نے دو ڈھکن دوائی لے کر مجھے پلائی تھی''۔

ماسٹر صاحب نے جب عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک کیا تو انہیں عامر کا جسم تندور کی مانند تپتا محسوس ہوا۔ عامر کا چہرہ پیلا اور ہونٹوں پر خشکی کے آثار دیکھ کر ماسٹر صاحب نے اسے فوری طور پر آج کی چھٹی دے دی اور مزید چھٹی نہ کرنے کی تنبیہ کرتے ہوئے اپنی نشست پر جا بیٹھے۔

دوسرا طالب علم عبدالرشید تھا۔ اس کا شمار بھی عام سے طلباء میں ہوتا تھا۔ جب اُس سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا۔

''جناب میں اپنے والد کے ساتھ بکرا بیچنے منڈی گیا تھا۔ وہاں سارا دن گزر گیا۔ بکرا بیچ کے شام گھر واپسی ہوئی۔ صبح پورے جسم میں تھکاوٹ سے درد تھا''۔

''اچھا......تو کس نے کہا تھا کہ منڈی مویشیاں جاؤ......نہ جاتے!''

ماسٹر صاحب نے عبدالرشید کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اُستاد کی جانب دیکھ کر بولا۔

''جی والد صاحب نے کہا تھا کہ میرے ساتھ منڈی چلو......''

ماسٹر صاحب قدرے غصے سے بولے۔

''آئندہ کوئی بھی منڈی نہیں جائے گا''۔

مگر وہ خود بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ بھلا اس ڈراوے میں کون آئے گا؟

اگلا طالب علم ثاقب علی تھا۔ جو خاصا فطین لڑکا تھا پھر بھی چھٹی؟

''ہاں ثاقب علی! چھٹی کیوں کی؟

''مجھے امی نے مرغیاں فروخت کرنے کے لیے بازار بھیج دیا تھا''۔

ثاقب شرمندگی محسوس کرتے ہوئے زمین کو طرف دیکھنے لگا...... پیچھے بیٹھے لڑکے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے تو ماسٹر صاحب نے ڈانٹتے ہو کہا۔

''خاموش! کام کرتے نہیں......چھٹیاں کرتے......اور باتیں بھی......خاموش! آواز نہ آئے!!''۔

پھر آکاش نظریں جھکائے ماسٹر صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔آکاش ایک ہر دلعزیز، صاف گو، محنتی اور لائق طالب علم تھا......اور اس کا شمار ماسٹر صاحب کے پسندیدہ ترین طلباء میں ہوتا تھا۔ جب آکاش سے پوچھا گیا کہ تم نے تو حد ہی کر دی۔ چار دن غیر حاضری......نہ درخواست نہ کوئی اطلاع......تو وہ خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پوری کلاس اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ماسٹر صاحب نے دوبارہ پوچھا تو پھر بھی گردن نیہوڑائے خاموش کھڑا رہا۔

تیسری بار پوچھنے پر کہنے لگا

’’بس نہیں آ سکا‘‘۔

استاد نے جب اُسے بازو سے جھنجھوڑ کے پوچھا تو بولا۔

’’جناب! بس ویسے ہی نہیں آیا...... جو مرضی ہو سزا دے دیں‘‘۔

ماسٹر صاحب اس کے جواب کو ہضم نہ کر سکے اور دوسرے لڑکوں کی جانب مڑے۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

’’سب کان کھول کر سن لو! آئندہ غیر حاضری برداشت نہیں کی جائے گی...... جو چھٹی کرے گا اُس پر جرمانہ بھی ہوگا اور سزا بھی دی جائے گی۔

اب ان طالب علموں کی باری تھی جو غیر حاضری کو حاضری پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ وہ طالب علم تھے جن کے پاس عجیب وغریب بہانوں کی کمی نہ ہوتی...... ہر بار منفرد بہانہ۔

ایک نے کہا ’’جناب! میں آ رہا تھا کہ امی نے منع کر دیا‘‘۔

’’امی نے منع کر دیا؟...... واہ!‘‘

دوسر بولا...... ’’میں تو سارا دن اپنی کتابیں ہی ڈھونڈ تا رہا‘‘۔

’’کیا بستے میں نہیں تھیں؟‘‘...... اُستاد نے پوچھا

’’جناب! بستہ تو میرے پاس تھا...... مگر کتابیں اس میں موجود نہ تھیں۔ میرا بھائی غلطی سے اپنے اسکول لے گیا تھا‘‘۔

تیسرا غیر حاضری کی وجہ پوچھنے سے پہلے بول اٹھا۔

’’جناب! میری آنکھ دیر سے کھلی تھی‘‘۔

چوتھے نے بہانہ تراشا۔

’’میرے کپڑے گندے تھے‘‘ (حالانکہ اس نے کپڑے تو آج بھی میلے کچیلے ہی پہنے ہوئے تھے)۔

جتنے طلباء تھے...... اتنے ہی بہانے...... مگر آ کاش نے ایک بھی بہانہ یا غیر حاضری کا

جواز گھڑنے سے گریز کیا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے کسی کو نصیحت کی، کسی کو جھاڑ پلا دی تو کسی کو کان پکڑ وا دیئے۔

بعدازاں! پڑھائی کا عمل شروع ہوا، کچھ دہرائی ہوئی، کچھ نیا سبق پڑھایا گیا۔ جب کاپیاں دیکھ کر ماسٹر صاحب کلاس سے باہر نکلنے لگے تو آکاش کو کمرے سے باہر بلا لیا اور ایک طرف لے جا کر انتہائی شفقت سے پوچھا۔

''بیٹا تم نے چار چھٹیاں کر لیں...... مجھے بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟......''

اس کی نظریں اُستاد کے قدموں پر تھیں اور اُستاد اُس کے چہرے کے خدوخال کا جائزہ لے رہا تھا۔ گو اُستاد کی محبت اور مشفقانہ روّیے پر آکاش کی کچھ ڈھارس بندھی لیکن اُس کے چہرے پر شرمندگی، زبان میں لکنت اور آنکھوں میں نمی کے آثار واضح تھے۔

''جناب! میرے پاس جوتے نہیں تھے......امی نے کہا جب ابا آئے گا تو خرید کر دے گا......اور میں چار روز تک ابا کی راہ ہی تکتا رہا''۔

اُستاد نے آکاش کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اُس کے پاؤں کی جانب دیکھا تو آکاش نے پرانے سے زنانہ چپل پہن رکھے تھے جن میں اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں گویا مسکرا رہے تھے۔

سومی

سٹیج سیکرٹری سومی کی تعلیمی قابلیت، انتظامی امور اور غیر نصابی سرگرمیوں کی اجمالی تصویر حاضرین کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ ہال میں بیٹھے خواتین و حضرات اور طلباء و طالبات انہماک سے سٹیج سیکرٹری کی جانب متوجہ تھے۔سمیرا عرف سومی خراماں خراماں سٹیج کی جانب بڑھ رہی تھی......اور ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ پرنسپل نے اسناد وزیرِ تعلیم کے ہاتھوں میں دیں...... جنہوں نے سومی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے مبارکباد دی اور اسناد اسے پیش کر دیں۔حاضرین نے ایک بار پھر تالیاں پیٹیں اور سومی مسکراتی ہوئی سٹیج سے نیچے اتر آئی...... مووی میکر نے ایک ایک لمحہ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیا اور اطراف میں کھڑے فوٹو گرافرز کے کیمروں کے فلیش تھمنے کو نہ آ رہے تھے۔

سٹیج کے بالکل سامنے دوسری صف میں بیٹھی ہوئی سومی کی والدہ کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار جاری تھے۔وہ خوشی کے ان لمحات میں خیالوں ہی خیالوں میں ماضی بعید میں کھو گئی۔ جب سومی کی پیدائش سے پہلے اس کے ہاں اوپر تلے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں نے جنم لیتے ہی آنکھیں بند کر لیں تھیں...... ایک عرصہ تک وہ اور اُس کا خاوند اولاد کے تصور سے ہی خوف محسوس کرنے لگے تھے۔ایک انجانا سا خوف اُن کے قلب و ذہن پر پر چھائیوں کی صورت لہرا جاتا جس کے حصار سے وہ کبھی باہر نہ نکل پاتے۔آخر کار شادی کے پندرہ سال بعد ان ہاں سومی کی پیدائش آپریشن کے ذریعے ہوئی۔والدین کی اکلوتی اولاد......جس کی آمد کے ساتھ گویا ان

کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آ گئی تھی......

سومی کے جنم کے ساتھ ہی ایک اور خدشہ نے بھی جنم لے لیا تھا......نہ تو اُس کی صحت تسلی بخش تھی اور نہ ہی اُس کا بدن عام بچوں کی ہیئت پر تھا۔ وزن کی کمی اور صحت کی گرانی کے سبب اُسے اکیس دن تک نرسری میں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رہنا پڑا......سومی کی والدہ تو تیسرے دن ہی ہسپتال سے گھر منتقل ہو گئی تھیں مگر اپنی بیٹی کو نا چاہتے ہوئے بھی نرسری میں چھوڑ آئیں۔ والد ایک دن کے وقفے سے ہسپتال جاتا......دور سے بیٹی کو دیکھتا اور آنسو بہا کر واپس لوٹ آتا۔ والدہ کی حالت ایسی تھی کہ فون کی گھنٹی بجتی تو اُس کا دِل دہل جاتا۔ دروازہ زور سے بند ہوتا تو اُس کا اندر تھر تھرا اُٹھتا......اونچی آواز تک برداشت نہ کر پاتی۔ اگر کوئی گاڑی گھر کے باہر سے گزرتے ہوئے ہارن بجا دیتی تو وہ کانپ کر رہ جاتی۔ کئی راتیں وہ بستر پر لیٹی مگر سو نہ پائی......خاوند حوصلہ بڑھاتا اور تسلی کے لئے اسے دوسروں کی مثالیں دینے لگتا۔ مشیت ایزدی اور نبی پاک ﷺ کے اُسوہ کا حوالہ دیتا مگر اُسکے آنسو تھمنے میں نہ آتے۔ عزیز و اقارب بھی اپنی اپنی عقل و فراست کے مطابق کبھی ڈھارس بندھاتے تو کبھی خدشوں کا اظہار کرتے......کوئی اُمید کی کرن دکھاتا اور کوئی بے رحم جملوں سے اس کا دل کرچی کرچی کر جاتا۔ دونوں میاں بیوی ایک عجیب طرح کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں...... والدہ اپنا چہرہ کمبل میں چھپا لیتی اور والد گھر سے باہر نکل جاتا۔ وہ اکیلا چلتا رہتا بعض رشتہ داروں کے تلخ جملے اُسے اپنے پیچھے آتے محسوس ہوتے۔ وہ سب سے دور چلا جانا چاہتا تھا......اُسے سب کی باتیں ایک بوجھ محسوس ہوتیں......وہ تنہا رہنا چاہتا تھا......اُسکی حالت عجیب تھی......دنیا کی نظر میں دونوں میاں بیوی پاگل پن میں مبتلا ہو چکے تھے......بعض خواتین سومی کی والدہ سے عجیب عجیب توضیحات بیان کرتیں جن سے اُمید کا سورج ڈوبتا محسوس ہوتا۔

آخر کار ایک دن سومی کی والدہ نے اپنے دل میں چھپے وسوسے کا ظہار اپنے خاوند سے

کر ہی دیا۔

''اگر ہماری یہ بیٹی بھی فوت ہوگئی تو......؟''

خاوند نے جواب دیا۔

''اللہ وہ ہے جو زمین اور آسمان کا مالک ہے۔ سانسوں کا سلسلہ اُس کے حکم سے جاری وساری ہے......وہ زندوں کو مردہ کرتا ہے اور مردوں کو زندگی سے نوازتا ہے...... ہماری بیٹی الحمداللہ زندہ ہے اور زندہ رہے گی......''

خاوند کے منہ سے تسلی بھرے الفاظ سن کر وہ کافی دیر تک ہشاش بشاش رہی۔

''ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟''

سومی کا والد ہسپتال سے آنے والی فون کال سننے کے بعد ابھی رسیور کریڈل پر رکھنے والا ہی تھا کہ بیوی نے سوال کر دیا۔

''بچی کے کچھ ٹیسٹ کرنے ہیں۔ اُس کی ہی اطلاع دے رہا تھا''

وہ رسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''بالشت برابر بچی ہے میری......اُسکے کتنے ٹیسٹ کریں گے؟...... وہ مار دیں گے اُسے''

وہ رونے لگی۔

''نہیں ایسی باتیں نہیں کرتے......وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں اور بھلا ہماری بچی کو مار کے اُنہیں کیا ملے گا؟......''

وہ اُس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

''نہیں نہیں!......وہ میری بچی پر تجربے کر رہے ہوں گے''۔

وہ مسلسل رو رہی تھی

''اوہو......اب بس بھی کرو......انشاءاللہ! جلد ہماری بیٹی ہمارے ساتھ ہوگی''

وہ اُسے تسلیاں دے رہا تھا مگر اُسکی تسلیاں سومی کی ماں کو بہلانے کے کام نہ آسکیں۔ گھر کی فضاء میں اُداسی بڑھنے لگی۔

اکیسویں دِن کا سورج اپنی کرنیں چارسو پھیلا رہا تھا......وہ دونوں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر چونک گئے......سومی کی والدہ کا نوالہ حلق سے نیچے نہ اُتر سکا......والد نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔فون کے پاس جا کر کچھ توقف کے بعد اُس نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''ارے جناب کہاں ہو؟'' ریسیور کان سے لگاتے ہی اُسے ڈاکٹر شہزاد نجیب کی مانوس سی آواز سنائی دی۔

''جی......خیریت! ڈاکٹر صاحب......!'' اُس نے پژمردہ لہجہ میں سوال کیا۔

''جناب! آپ آج گیارہ بجے تک ہسپتال آجائیں''

''میری بیٹی تو ٹھیک ہے ناں!......'' والد نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

ہاں ہاں!...... بالکل ٹھیک ہے۔بس کچھ ٹیسٹ کروائے ہیں جن کی رپورٹس گیارہ بجے تک آجائیں گی۔آپ بھی آجائیں''۔

ڈاکٹر نے ''اللہ حافظ'' کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ڈاکٹر نے سومی کے والد کے وجود میں طاقت بھر دی۔دونوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور والد ہسپتال جانے کی تیاری کرنے لگا۔سومی کا والد چلڈرن وارڈ سے ملحقہ نرسری میں پہنچا مگر وہاں سومی کو موجود نہ پا کر گھبراہٹ نے اُسے سرتاپا گھیر لیا۔سومی کا والد اسی گھبراہٹ میں مبتلا تھا کہ

ایک نرس کی آواز سنائی دی۔

’’آپ کی بچی یہاں ہے سر......‘‘

ایک نرس بچی کو گود میں اُٹھائے نرسری میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کررہی تھی......سومی کے والد نے دل ہی دل میں نجانے کتنی دعائیں اُس نرس کو دیں۔ نرس نے بچی کو پیار کیا اور والد کو دیتے ہوئے بولی۔

’’آپ ڈاکٹر سے ملتے جایئے گا‘‘

اُس نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر کے کمرے کی جانب چل پڑا۔

سومی کا والد گھر میں داخل ہوا تو گویا خوشیوں کی برسات آ گئی......عزیز و اقارب کا تانتا سا بندھ گیا۔ سومی کے والد نے بچی کا صدقہ اُتارا۔ سومی کی والدہ کی سہیلیوں نے بچی کے لیے کئی تحائف لے رکھے تھے۔

وقت گزرنے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب سومی توتلی زبان سے معصوم سی باتیں بھی کرنے لگی۔ بعض دفعہ جملہ ادا کرتے وقت فقرا مکمل نہ کر پاتی جو سننے والے کو اور بھی بھلا لگتا۔

سومی کی والدہ کو وہ دن بھی یاد آیا جب وہ اُسے اسکول داخل کروانے گئے تھے۔ پھر سومی کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہوا......تو دوسرے ہی دن ماہرِ امراضِ چشم سے مکمل چیک اپ کروایا گیا......سومی کی آنکھیں مکمل طور پر ٹھیک تھیں ......اس کے والدین نے اللہ کا شکر ادا کیا اور گھر پہنچ کر اُس کا صدقہ اتارا گیا تھا۔

اُس کے والدین نے انتہائی لاڈ اور پیار سے اپنی بیٹی کی پرورش کی۔ سومی نے جب میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو گھر میں ایک بڑی سی پارٹی کا اہتمام کیا گیا جس میں سومی کی تمام ہم جماعت لڑکیوں نے بھی شرکت کی۔ ایف ایس سی کے بعد سومی کو میڈیکل کالج میں داخل

کروایا گیا اور آج وہ میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنے جارہی تھی۔

سومی کے والد نے بیوی کا ہاتھ پکڑا تو وہ چونک کر ماضی کی یادوں کے دریچے واپس حال میں لوٹ آئی......

''مبارک ہو بیگم......''

''آپ کو بھی......''

سومی کی والدہ نے خاوند کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

وزیرِ تعلیم کی تقریر ختم ہو چکی تھی اور اب سٹیج سیکرٹری شکریے کے ساتھ ساتھ پروگرام کے اختتام کے اعلان کے ساتھ حاضرین محفل کو بڑے ہال کی جانب جانے کا کہہ رہا تھا جہاں چائے اور دیگر لوازمات کا انتظام کیا گیا تھا۔

اچانک ایک گونج دار دھماکہ ہوا...... روشنی کا ایک جھماکا اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا...... دیواروں میں شگاف پڑ گئے اور چھت کا ایک حصہ بھی فرش پہ آ گرا...... ہر طرف چیخ و پکار تھی......خون ہی خون...... جا بجا انسانی اعضاء...... پوزیشن ہولڈرز کی اسناد اور انعامات خون سے رنگے ہوئے ہال میں اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ایک پل میں کئی لوگوں کو موت نے نگل لیا......جو زندہ تھے وہ حواس باختہ ہو چکے تھے...... زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں دور دور تک سنی جارہی تھیں......سیکیورٹی پر مامور کئی جوان لقمہءِ اجل بن گئے۔ کچھ ہی دیر میں پولیس اور امن و امان قائم کرنے والے اداروں کے جوان جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ زخمیوں کو ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال پہنچایا جانے لگا۔کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔سومی کی والدہ کو بیہوش حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔

''خودکش حملہ میں وزیرِ موصوف کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ اس کی زد سے بچ گئے جبکہ کئی طلبہ دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔خودکش حملے میں شہید ہونے والوں میں طلبہ کے علاوہ

ایک کثیر تعداد بچوں کے والدین اور اساتذہ کی بھی ہے''۔

میڈیا کے ذریعے خودکش حملے کی خبر پوری دُنیا میں پہنچ گئی تھی......دوسرے روز بے شمار لاوارث اور ناقابلِ شناخت لاشوں کو اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔

تین روز بعد جب سومی کی والدہ ہوش میں آئی تو اپنے اطراف میں کھڑے عزیزوں سے اپنی بیٹی اور خاوند کے متعلق استفسار کرنے لگی۔عزیزوں نے بتایا کہ اُنہیں بھی چوٹیں آئیں ہیں لیکن وہ دونوں اب خیریت سے ہیں۔ پانچ دن کے بعد سومی کی والدہ کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ وہ جلد از جلد اپنی بیٹی اور خاوند سے ملنا چاہتی تھی......

گاڑی گھر کے احاطے میں رُکی تو بھانجوں نے اُسے سہارا دے کر گاڑی سے اُتارا اور کمرے میں لے گئے۔مگر اُس کی نگاہیں اپنی بیٹی اور خاوند کو تلاش کر رہی تھیں۔جب اس کی نظریں چاروں جانب سے نامراد لوٹ آئیں تو وہ روتے ہوئے بولی۔

''مجھے بتائیں وہ کہاں ہیں......؟ کس کمرے میں ہیں......؟''

کمرے میں موجود ہر شخص کی آنکھیں اشکبار اور زبانیں گنگ تھیں۔

وہ ہر ایک سے بار بار ایک ہی سوال پوچھتی رہی......مگر اس کے سوال کا جواب آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اثاثہ

میرے پھٹے پرانے جوتوں کے چہرے پر برسوں کا سفر طے کرتے اور مختلف موسموں سے ملتے ملاتے اس قدر شکنیں اور شگاف پڑ چکے تھے کہ اب پانی، کیچڑ اور گرد بغیر کسی مزاحمت تلووں سے آر پار گزر جاتی۔ میں جب کبھی دوستوں عزیزوں کے ساتھ کسی محفل، ہوٹل یا کسی بھی تقریب میں جاتا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا کہ سب میرے چہرے کی بجائے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہے ہیں،......میں پریشان ہو جاتا......سردی کے موسم میں پاؤں کی ٹھنڈک سر میں درد کر دیتی تھی اور اگر کسی گیلی جگہ پر پاؤں پڑ جاتے تو فوراً گیلے ہو جاتے۔

سروس کی دکان پر شوکیس میں عمدہ عمدہ اور نت نئے ڈیزائین کے جوتے دیکھ کر دل میں خیال آتا کہ جیسے تیسے کر کے ایک جوڑا خرید ہی لوں......مگر جیب اجازت نہ دیتی اور میں دِل میں ہی دل میں شرمندہ سا ہو کر آگے بڑھ جاتا......کئی سال گزر گئے ہیں میں نے نئے جوتے نہیں خریدے۔

میرے دوست نئے چمکتے جوتے پہنتے تو ان کی چال ڈھال بھی دیدنی ہوتی۔ میں ان کے جوتوں کی چمک اور ڈیزائن ہی دیکھا کرتا......مہنگائی کے اس دور میں بیوی بچوں کو پیٹ بھر کھلانے کے لیے مجھے اپنی بہت سے ضروریات ترک کرنا پڑتی تھیں......مکان کا کرایہ......بجلی، گیس اور پانی کے بل......بچوں کی روزمرہ کی ضروریات......خوردونوش کا سامان لینے کے بعد جیب خالی ہو جاتی......ایک تنخواہ بھلا کتنی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کا سامان کر سکتی ہے۔

سردی سے پاؤں کو بچانے کے لیے میں نے لنڈا بازار سے کئی جوڑے جرابیں تو لے لیں اور دو دو تین تین جوڑے اوپر تلے پہن کر جوتوں کی کمی کو پورا کرتا رہا مگر وہ جرابیں بھی تو پرانی ہی ہوتیں...... جب لوگوں کی دعاؤں کے بعد بارش ہو جاتی تو میرے لئے کئی مسائل کھڑے ہو جاتے

اور برسات کے دن تو میرے لیے کسی اذیت سے کم نہ ہوتے......کئی سال پہلے یہ جوتے میں نے اپنے ایک جاننے والے کی دکان سے خریدے تھے......جوتے خریدنے سے پہلے کتنی ہی بار میں نے اُسے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھائے رکھا اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے مہنگائی اور معاشی مسائل پر لمبی چوڑی تقریر بھی سنائی۔۔شاید وہ میرے جانے کے بعد میری حالت پر دل کھول کر ہنسا بھی ہوگا......اور سوچتا ہوگا...... بابو صاحب! آپ نے ایک جوتے کو سو بار الٹ پلٹ کر دیکھا اور اب بھی شک میں مبتلا ہو کہ جوتا مضبوط نہ ہوا تو دوسرا کیسے خریدوں گا؟......اور پھر جب بل ادا کرتے وقت میں نے چھوٹے چھوٹے نوٹ کئی بار گن کر اُس کے حوالے کیے تو اُس نے میری آنکھوں میں کافی دیر تک بڑے غور اور حیرت سے دیکھا بھی تھا۔

دسمبر کی ایک رات جب میں سروس کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا تو بے اختیار ہاتھ جیب میں چلا گیا۔میری جیب میں پانچ سو کا نوٹ موجود تھا۔میں بھی دکان کے اندر چلا گیا۔جوتوں کی نئی ورائٹی بھی آچکی تھی۔دکان کے اندر کافی رش تھا۔بہت سے مرد اور خواتین اپنے اپنے بچوں کے ساتھ مختلف رنگ اور ڈیزائن کے جوتے دیکھ رہے تھے۔میرے کھڑے کھڑے کئی جوتے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے......خریداروں میں نو دولتیوں کی اکثریت تھی جو شاید یہ جتانا چاہتے تھے کہ اُن کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں۔وہ جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جو چاہیں خرید سکتے ہیں۔

زمانہ بدل چکا ہے۔پہلے لوگ ظاہری شان وشوکت سے اجتناب برتتے تھے۔کھاتے پیتے لوگوں کے پاس بھی ایک دو جوڑے جوتے ہوتے اور یہی معیار کپڑوں میں رکھتے تھے مگر اب چھوٹے چھوٹے بچے بھی اتنا کچھ خرید لیتے ہیں کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

جوتوں کی قیمتیں سن کر میں نے جوتا خریدنے کی خواہش ایک بار پھر اپنے دل سے نکال دی......اس کا حل یہ نکالا کہ میں تیز تیز قدموں سے چلتا تا کہ خون کی گردش سے وجود گرم رہے۔اس طرح میرے پاؤں بھی گرم ہو جاتے۔موسمِ سرما میرے ارادے کے سامنے ہارتا ہوا نظر آنے لگا کیونکہ میں بڑی تندہی سے اس کا مقابلہ کیے جا رہا تھا......

میرے ارادے کو نئی توانائی اُس سیٹھ کو دیکھ کر ملی جو کروڑوں روپے آمدنی ہونے کے باوجود پرانے جوتے اور پرانی بنیان زیبِ تن کیئے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر میری خوداعتمادی میں دوگونہ اضافہ ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں ایک غریب شخص ہوں اور میرے سامنے لاکھوں کروڑوں روپے کے اثاثہ جات رکھنے والا گزرا ہے۔ اس میں اور مجھ میں صرف کروڑوں کا فرق ہے حالانکہ اس نے بھی جوتے پرانے ہی پہن رکھے ہیں...... میں احساسِ شرمندگی کے حصار سے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے نئے جوتے خریدنے والوں اور کئی کئی جوڑے کپڑے سلوانے والوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

جب گھر پہنچا تو میری بیوی میری منتظر تھی...... میں جب سکون سے بیٹھ گیا تو بیوی گویا ہوئی

''کھانا کھائیں گے......؟''

دنیا کا فضول ترین سوال...... بھلا ایک بھوکا کھانا نہیں کھائے گا تو کیا کرے گا؟ میں نے خودکلامی کی اور حسبِ روایت بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کھانا لے آئی ابھی میں نے پہلا لقمہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ بولی۔

''اجی! بچے کی کاپیاں اور کپڑے خریدنے کے لیے کچھ رقم مل جائے گی......''

میں نے اُس کا چہرہ قدرے حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔

''پہلے والی کاپیاں ختم ہو چکی ہیں......؟''

''وہ تو کئی دنوں سے نئی کاپیاں مانگ رہا تھا مگر میں آپ کی تنخواہ کے انتظار میں تھی''...... بیوی نے جواب دیا۔

میں نے جواب سننے کے بعد پوری توجہ کھانے پہ مرکوز کر دی۔ کھانا کھانے کے بعد بیوی نے میرے جوتے پالش کرنے کے لیے اٹھائے تو میں نے جوتے اُس کے ہاتھوں سے لے لئے کیونکہ انہیں پالش کرنا پالش کے زیاں کے مترادف تھا۔

آج پھر مجھے نئے جوتے خریدنے پہ مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ مجھے کئی مثالیں دے رہی تھی مگر

میں سب سنی ان سنی کررہا تھا۔

''آپ باہر نکلتے ہیں تو لوگ آپ کے پھٹے پرانے جوتے دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے؟''

''لوگوں کی سوچ سے میرا کیا لینا دینا ہے......فضول باتیں مت کیا کرو؟''میں نے جواب دیا۔

سوال جواب جاری تھے کہ فاروق برآمدے میں آکر اچھل کود کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''ابو جی! ٹیچر نے کہا ہے کہ کل نئی کاپیاں،......نئے رنگ...... نیا بستہ لانا......اور مجھے اسکول کی نئی یونیفارم بھی خرید کردیں''

میں نے فاروق کو گود میں لیا تو میری بیٹی سدرہ بھی کمرے میں آ گئی ......ابو جی! ابو جی! میرے لیے بھی نئے کپڑے......''

بیوی نے کڑھتے ہوئے کہا۔

''اسے تو ہر وقت کچھ نہ کچھ ضرور ہی خریدنا ہوتا ہے......خاموش رہو''۔

سدرہ سہم سی گئی تو میں نے اُسے بھی اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

''بچوں کو ڈانٹا نہ کرو......اس طرح ان میں خوداعتمادی کی کمی ہوجاتی ہے''۔

میں نے بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا مگر وہ تھی کہ غصے سے لال ہورہی تھی......

''آپ اپنے لیے نئے جوتے ضرور خریدیں......''اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں نے سدرہ کے بالوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے جواب دیا

''بچوں کی تعلیمی ضروریات کے سامنے سب ہیچ ہوتا ہے......ہمیں ان کی تعلیمی ضروریات کو ترجیح دینی چاہیے......''

پھر بچوں سے پوچھا

''ہاں تو میرے بچوں نے کیا کیا لینا ہے؟''

وہ ضروریات کے ساتھ ساتھ خواہشات کی تفصیلات بھی بتانے لگے.....نئی گڑیا...... غبارے.....کھیلنے کے لیے موٹر.....بالوں کے کلپ.....رنگوں کی ڈبیاں.....اور نجانے کیا کیا......

میں نے جوں ہی حامی بھری تو وہ ضد کرنے لگے کہ ابھی کے ابھی.....جب شریکِ حیات نے سختی سے منع کیا کہ صبح خریداری ہوگی تو فاروق رونے لگا اور سدرہ بھی خفا ہوگئی.....میں نے بیوی کو کافی سمجھایا کہ ابھی خرید لیتے ہیں بازار تو کھلا ہے مگر وہ نہ مانی.....بالآخر صبح کا پروگرام ہی ترتیب دیا گیا...... سدرہ صبح پر راضی ہوگئی اور مجھے اپنی ننھی منی بانہوں میں بھر لیا......

میں نے لاڈ سے کہا.....''میری بچی جو کہے گی وہی صبح خریدیں گے''۔

پھر تھوری دیر میں ہی بچے سو گئے۔

''کیا آپ بھی جوتے خرید رہے ہیں''.....میری بیوی کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''اس بار نہیں.....مگر اگلی تنخواہ پر ضرور خرید لوں گا''.....میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اِس بار دکان کا سابقہ ادھار بھی چکایا ہے اور میری جیب میں باقی بچا ہی کیا ہے؟......

''آپ اس وقت جوتے لینا جب سردی گزر جائے گی''.....اس نے بے زاری سے کہا۔

وقت اپنی ڈگر پہ چلتا رہا.....مجھے اب ٹانگوں میں درد رہنے لگا تھا.....کئی دن تک میں اس درد کو موسمی اثرات ہی سمجھتا رہا مگر موسم بدلنے کے باوجود اس میں کوئی آفاقہ نہ ہوا.....اب تو میرے پاؤں میں مسلسل درد رہنے لگا تھا اور پنڈلیوں میں سوزش بھی ہونے لگتی.....میں نے تیز چلنے سے اجتناب برتنا شروع کر دیا۔

ایک دن میں سروس کی دکان کے سامنے سے گزرا.....اس دن میں گھر تک لوگوں کے جوتے ہی دیکھتا رہا۔سامنے چوک میں موٹے نسواری رنگ کے کپڑوں والے لڑکے نے بھی تو سروس کا جوتا ہی پہنا ہوا تھا.....ریڑھی سے سامان لینے والے،تھڑے کے پاس انتظار کرنے والے.....خوانچہ فروش حتیٰ کہ بوریاں اٹھانے والا مزدور بھی سروس کے پیزار پہنے دکھائی دیا.....میں نے اپنے جوتوں کا

جائزہ لیا......وہی پرانے، کھلے منہ، ٹانکوں سے جڑے، شکنوں سے بھرے، پالش کے باوجود بھدے بھدے......جوتے تھے۔

کیا میں مفلس ہوں؟ میں نے خود سے سوال کیا۔

نہیں......میں مفلس ہرگز نہیں ہوں......میں اس ملک کے چار فیصد تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک ہوں......چھیانوے فیصد مجھ سے نیچے ہیں......میں نے خود کو تسلی دی۔

سامنے کی دکان سے سدرہ کی بتائی چیزیں خریدیں......غبارے، جھمکے، پراندے، چوڑیاں، ببل اور ٹافیاں......اور گھر کی راہ لی۔

مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میرے بچوں کی فرمائشیں پوری ہو رہی ہیں۔ میرے جوتے، میرے کپڑے پرانے ہیں تو کیا ہوا؟ میں جو کچھ بھی ہوں، جیسا ہوں، ٹھیک ہوں......میں تعلیم یافتہ ہوں اور سب سے بڑھ کے سرکاری ملازم ہوں......حلال کماتا ہوں......حلال کھاتا ہوں......پھر شرم کیسی......مجھے مطمئن ہونا چاہیے......سارے راستے خود سے ہم کلام رہا......گھر کی دہلیز پر پہنچا......دستک دی......

فاروق اور سدرہ نے میرے ہاتھ میں شاپر دیکھا تو بھاگے بھاگے آئے اور اپنی اپنی اشیاء لینا شروع کر دیں......جب سدرہ جھمکے اٹھا کر دیکھ رہی تھی تو اُس کے چہرے کی شادابی دیدنی تھی......فاروق خوشی سے چہک اٹھا......وہ غباروں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

سدرہ نے اپنی والدہ سے کہا

''امی! امی! میں اپنی تمام سہیلیوں کو بتاؤں گی کہ ابو میرے لیے جھمکے، پراندی اور چوڑیاں لائے ہیں''

فاروق بھی کہنے لگا

''میں بھی اپنے دوستوں کو بلا کے غبارے اڑاؤں گا''

چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل بچوں کو کس قدر خوش کرتی ہے......

فاروق نے غبارے اٹھائے اور لاکھ منع کرنے کے باوجود یہ جا وہ جا......!

بچوں سے فارغ ہو کر جب میں کھانا کھانے لگا وہ بولی......''کتنا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اپنے لئے بھی ایک جوڑا نئے جوتے خرید لاتے؟''

''لے آؤں گا......لے آؤں گا......میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں سودا سلف لینے بازار چلا گیا......خریداری کے بعد میرے پاس صرف بیس روپے بچے......مگر آج میں بے حد خوش تھا......ایک سرور اندر ہی اندر مجھے میسر تھا......بار بار سدرہ اور فاروق کے مسکراتے، ہشاش بشاش چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور وقت کبھی رکتا نہیں......آخر گزر ہی جاتا ہے......سدرہ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور آج وہ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہ رہی ہے......فاروق نے ایم ایس سی تک اچھے نمبروں سے تعلیم مکمل کی اور ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر تعینات ہے۔ہم دونوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی قربانی دے کر اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کر لیا اور بچوں کی اچھی پرورش کا صلہ یہ ہے کہ آج ہمارے دل مطمئن اور دنیا کی ہر خوشی سے سرشار ہیں......والدین کا اثاثہ یہی سرشاری ہوتی ہے۔

اُس پار

جب بٹوارہ ہورہا تھا تو کئی اُس پار سے اِس پار آنے کی وجہ سے بکھر گئے ۔ کئی ایسے تھے جو اِس پار آنے کی بھاری قیمت بھی چکا رہے تھے......انہی میں ماسی صغریٰ بھی تھی ۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ جب اِس پار پہنچی تو والدین ،بہن ، بھائی اور بھاوج سے بچھڑ چکی تھی ۔ ۔اس کی سوچ تھی کہ وہ بھی جلد یہاں آ جائیں گے ۔مگر بٹوارے نے جہاں زمین کے ٹکڑے کیے وہاں خاندانوں اورانسانوں کے درمیان بھی ایک خونی لکیر کھینچ دی ۔اس کے والدین ، بھائی ،بہن ، بھاوج نجانے کس موڑ پہ زندگی کی بازی ہار گے تھے ۔ اِس پار پہنچنے کی بھاری قیمت چکا کے دونوں واہگہ کراس کر سکے ۔اس کا خاوند بھی اِس پار زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا......ایسی بیماری لگی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ دنوں میں مٹی کے ساتھ جا مٹی ہوا ،اور ماسی صغریٰ بھری دُنیا میں اکیلی رہ گئی تھی ۔

وہ عباس پور گاؤں کی نکڑ پر کچے گھر میں زندگی کو دھکا دیئے جا رہی تھی ۔ ماسی صغریٰ محلے کے تمام مردوں ،عورتوں ، بچوں اور بچیوں کی ماسی تھی ۔ اپنی گزر بسر کے لیے وہ بچوں کے کپڑے سیتی اور شام کو قرآن پاک کا سبق پڑھایا کرتی تھی ۔

وقت گزرتا گیا ۔ ۔ ایک خاندان اُس پار سے اس پار اسی محلے میں ان بسا ۔وہ ناصرف ماسی کو جانتے تھے بلکہ ماسی کی ملاقات کا سبسب بھی بنے ۔ ۔ ۔پچیس سال بعد ماسی صغریٰ کو اپنی بہن کا پتا مل گیا ۔ ماسی کی بہن زندہ تھی ۔ ۔ ماسی نے خط لکھ وا بھیجا.......بہن نے بہن سے باتیں کیں ، دکھ بتائے ، ستم گنوائے ،کئی زخم ہرے ہوئے یادوں نے انگڑائیاں لیں ۔ اشکوں کا دریا بہہ نکلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خطوط کا سلسلہ جاری رہا ۔ ۔ ۔ ۔

ماسی صغریٰ کا بھائی بلوے میں کام آیا ۔ بھاوج اپنی عزت بچانے کی خاطر کنویں میں

کودگئی۔ بہن اسی افراتفری کے عالم میں اُس علاقہ میں جا پہنچی جہاں اس کی عزت اور زندگی دونوں ہی بچ گئیں۔اس نے شادی کر لی مگر غربت نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔۔۔

خاوند، دو بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل خاندان کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔اس کا بڑا بیٹا شفیق اب تو ماشاء اللہ اس کی شادی بھی کر دی گئی اور وہ ایک بیٹے کا باپ بھی تھا۔سات افراد کا یہ کنبہ کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ایک وقت کا کھانا ملتا تو دو وقت فاقہ کشی پہ مجبور......دیہاڑی پر کام کرنے والا شفیق کبھی کام پہ جاتا اور کبھی کام ہی نہ مل پاتا۔۔ماسی صغریٰ اب مطمئن رہنے لگی تھی۔شاید یہ خطوط اس کی تنہائیوں اور اکیلے پن کے ساتھی بن چکے تھے مگر اُس پار بہن اور اُس کے کنبے کے خراب معاشی حالات ماسی صغریٰ کو پریشان بھی کرتے۔ ماسی صغریٰ نے اپنے بڑے بھانجے اور اُس کی بیوی کو اِس پار آنے کی دعوت دی۔کافی تگ و دو کے بعد انہیں اِس پار آنے کے لیے پاسپورٹ اور دوسری ضروری دستاویزات میسر آئیں۔

آج وہ پہلی بار ماسی صغریٰ کے گھر آ رہے تھے۔ماسی صغریٰ نے صندوق سے ایک نیا جوڑا زیب تن کیا۔محلے والیاں بھی ماسی کے گھر انتظار کی گھڑیاں گننے جا رہی تھیں۔تھوڑی دیر بعد گلی سے بچوں کی آواز آئی کچھ بچے دوڑتے ہوئے آئے اور پکارا"ماسی ......ماسی۔۔آپ کے مہمان آ گئے"۔

اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ماسی صغریٰ اٹھی...... ہلکے ہلکے قدم دروازے کی جانب بڑھائے مگر دروازہ پہلے ہی کھل چکا تھا۔ایک چوبیس پچیس سال کا جوان اس کے ساتھ اسی عمر کی ایک لڑکی اور ایک چھوٹا سا بچہ ماسی صغریٰ کے سامنے کھڑے تھے۔

عجیب ملاقات تھی۔شفیق پیدا بھی نہ ہوا تھا جب ماسی صغریٰ اپنے خاوند کے ساتھ اِس پار آئی تھی۔۔۔شفیق اور ماسی صغریٰ گلے لگ کر دیر تک روتے رہے۔روتے روتے ماسی صغریٰ نے اپنی زندگی کی تمام محرومیاں، تنہائیاں اور دُکھ شفیق کو بتلا دیئے۔محلے دار خواتین بھی پاس کھڑی ضبط کے باوجود اشک بہائے جا رہی تھیں۔

پچیس برس کے سفر کو ان لمحات نے اپنے اندر سمیٹ لیا۔طویل سفر لمحوں میں طے ہوتا نظر آیا۔۔شفیق کا ویزہ تین ماہ کے لیے تھا مگر یہ تین ماہ تو تین گھڑیاں محسوس ہوئیں۔

ماسی صغریٰ شفیق کے آنے سے کھل اٹھی تھی۔کئی سالوں بعد اس کے گھر اپنوں کی رونق تھی۔اب شفیق، اُس کی بیوی اور بیٹا ماسی صغریٰ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بن چکے تھے۔شفیق نے جب ماسی صغریٰ سے واپس جانے کی بات کی تو ماسی کے چہرے پرغم کی پرچھاہی اورآنکھوں میں اشک نظر آرہے تھے۔اس نے اپنے کانپتے ہاتھ شفیق کے چہرے پر پھیرتے ہوے کہا۔۔۔۔۔شفیق بیٹا۔۔۔یہاں ہی رک جاو۔۔

شفیق کی والدہ کے خطوط سے وہاں کے حالات کا بھی پتہ چلتا رہتا تھا۔اُدھر فاقہ کشی، بھوک اور ننگ کے سوا کچھ نا تھا۔شفیق کے اس دوران کئی دوست بھی بن گئے۔انہوں نے بھی شفیق کو یہاں ہی رہنے کا مشورہ دیا۔ماسی کے پیار دوستوں کے اصرار پر شفیق نے باقی زندگی اِس پار ہی گزارنے کا فیصلہ کرلیا ......شفیق نے اپنے دوست کی دکان کے سامنے پھلوں کی ریڑھی لگانی شروع کی۔کئی سال ریڑھی پر کام کرنے کے بعد اس نے ایک ٹھیا لیا۔آج وہ پھلوں کی ایک بڑی دکان کا مالک تھا۔اللہ نے اسے ایک اور بچہ اور بچی بھی عطا کی۔کچھ عرصہ تک تو شفیق کا اپنی والدہ سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا اور پھر یہ سلسلہ کچھ تھم سا گیا۔۔۔

ایک دن شفیق کمرے میں خاموشی سے لیٹا چھت کو غور سے گھور رہا تھا۔۔۔۔۔جب اس کی بیوی نے پوچھا۔۔کیا بات ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں؟ تو وہ مسکرا کر ٹال گیا۔۔شفیق کو دراصل اُس پار کی گلیاں، محلے اور والدین کی یاد ستا رہی تھی...... وہ اُڑ کر اُن کے پاس چلا جانا چاہتا تھا اور اپنی بدلی ہوئی معاشی حالت سے انہیں بھی فیض پہنچانا چاہتا تھا۔کچھ دنوں بعد جب شفیق نے اپنے دل کا حال بیوی سے کہا تو وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔اسے شفیق کا یہ فیصلہ مناسب نہ لگا۔قدرے سوچنے کے بعد کہنے لگی ''آپ وہاں نہ جائیں بلکہ اُن سب کو کسی طرح یہاں لے آئیں......کیا

آپ بھول گئے ہیں کہ وہاں ہمارے حالات کیسے تھے؟''

شفیق نے بیوی کی جانب دیکھا وہ مسلسل بولے جارہی تھی ''وہاں بھوک اور فاقہ کشی کے علاوہ ہمیں کیا ملا...... یہاں تو ہم خوش وخرم رہ رہے ہیں اور ہمارا کاروبار بھی چل نکلا ہے'' ۔اب وہ شفیق کو سمجھا رہی تھی ۔۔

شفیق بیوی کی گفتگو کے بعد کچھ روز تک تو خاموش رہا لیکن دکھ اور اضطراب اندر ہی اندر اُسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ جب اُسے اپنے والد، والدہ، بھائی اور بہن کی یاد ستانے لگتی تو اُس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔

بیوی نے شفیق کو مشورہ دیا کہ دکان کے ساتھ ایک اور دکان بنا لے اور بڑے بیٹے کو اپنے پاؤں پہ کھڑا کرے۔ مگر شفیق کا دل اچاٹ تھا۔اُس نے یہ کہہ کر کہ ایک دکان ہی کافی ہے بات کو سمیٹ دیا۔

اب وہ اکثر دکان پہ بیٹھنے کی بجائے اپنا وقت اِدھر اُدھر گھوم پھر کے گزارنے لگا۔ بیٹے نے کاروبار سنبھال لیا...... پورے علاقے کے ریڑھی بان شفیق کی دُکان سے پھل اٹھاتے تھے۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی ۔ چھوٹا بیٹا اور بیٹی اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ماسی صغریٰ جب شام کو محلے کے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتی تو شفیق کا بیٹا اور بیٹی بھی اُن کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتے۔ ماسی صغریٰ سے سلائی کڑھائی کا کام چھڑوا لیا گیا تھا مگر قرآن کی تعلیم بدستور جاری رہی۔ پورا خاندان ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔مگر شفیق کے اندر یہ غم بڑھے جا رہا تھا کہ وہ تو یہاں اچھی زندگی بسر کر رہا ہے جبکہ اُس کا پورا خاندان وہاں فاقہ کشی پر مجبور ہے۔

ایک دن اچانک اُسے ایک خط موصول ہوا جس میں اسے والد کی وفات کی اطلاع دی گئی تھی ۔خط کا پڑھنا تھا کہ شفیق کی حالت غیر ہوگئی۔ والدہ، بہن اور بھائی کے افسردہ چہرے نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ شفیق غم میں ڈوب چکا تھا۔تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔۔۔قل میں دوست احباب شامل تھے۔ شفیق کو سب نے حوصلہ دیا مگر اسکے اندر کہرام برپا

تھا......وہ کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔اس سلسلے میں اُس نے رابطے بھی شروع کر دیئے تھے ماسی صغریٰ اور بیوی نے بہت سمجھایا اور روکنے کی کوشش کی مگر اب کی بار وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھا...... وہ مختلف لوگوں سے معلومات لیتا رہا......پُرانے کاغذات کہیں کھو چکے تھے اور نئے کاغذات بنانے کے لیے ایک عرصہ اور تعلقات کے ساتھ ساتھ کافی رقم بھی درکار تھی۔

کئی دنوں سے شفیق الجھا الجھا دکھائی دے رہا تھا......کئی راتیں آنکھوں میں ہی گزر گئیں۔اس دوران اس نے کسی ایجنٹ سے بات بھی کی تھی کہ وہ اپنے پیاروں سے ملنا چاہتا ہے۔ایجنٹ نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ اس کا کام ہی لوگوں کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پہنچانا ہے۔شفیق نے اپنے ارادے سے بیوی کو مطلع کیا تو اس نے روتے ہوئے پھر منع کیا گھر کے مسائل بتلائے مگر شفیق اب بھی نا مانا۔فیصلہ یہ ٹھہرا کہ شفیق اور اس کا بڑا بیٹا اُس پار جائیں گے جبکہ چھوٹی بیٹی اور بیٹا یہیں ماں کے پاس اِس پار رہیں گے۔

شفیق اپنے جواں سال بیٹے کے ہمراہ رات کی تاریکی میں ایک کشتی میں جا بیٹھا۔۔کشتی منزل کی جانب دوڑنے لگی۔۔۔۔مدتیں گزر گئیں شفیق کی ماسی کہتی ہے کہ وہ ۔۔'اُس پار۔۔' چلے گئے ہیں اور۔۔۔۔۔ماں کا کہنا ہے کہ نہیں وہ تو ''اُس پار'' ہی رہ گیا ہے۔ماں کی بات پر ماسی اپنے اپ کو پھر سے تقسیم ہوتا محسوس کرتی ہے۔۔۔

انقلاب

پیشے کے لحاظ سے وہ ایک معلّمہ تھی لیکن تعلیم نے اس کا بال بھی بیکا نہ کیا تھا۔کالج جاتی تو لڑکوں کی ٹولیاں اُسے گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک چھوڑنے آتیں......شروع شروع میں لوگ دبے لفظوں میں اس کا ذکر کرتے لیکن اب کھلے عام اس کی ذات پر بحث کرنے لگے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک عام معلّمہ سے محکمہ تعلیم میں بطور آفیسر تعینات ہوگئی۔ ایک درمیانے درجہ کی آفیسر ہونے کے باوجود عالی شان کوٹھی، لاکھوں روپے کا بنک بیلنس اوراوپر تک رسائی......وہ سیاسی قائدین سے لے کر دفاتر کے معمولی اہلکاروں تک سب کو خوش کرنے کے فن سے آشنا تھی۔اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو راتوں رات اسے شہرت کی بلندیوں تک لے گیا۔

کئی معلمات نے اُس کے خلاف حکام بالا سے رجوع کیا ،سیاسی قائدین کے دروازے کھٹکھٹائے اور سماجی شخصیات کو جھنجھوڑا مگر کسی جانب سے کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ محکمے میں ایک مضبوط لابی اس کی طرف دار تھی۔وہ اپنی من پسند معلمات کو آگے لاکر فوائد پہنچاتی اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال بھی کرتی جبکہ درس وتدریس سے لگن رکھنے والی اور طالبات کے حقوق کو سمجھنے والی معلمات کو دیوار کے ساتھ لگانے کا گر بھی جانتی تھی۔

میرا دوست عادل (جو خود بھی ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارے کا مالک ہے) جب مجھے اس کے بارے میں بتا رہا تھا تو مجھے یقین نہ آیا تھا......میں کئی روز تک سوچتا رہا......کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟......نہیں......نہیں!......میرے دوست کو ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہوگی......ایسا نہیں ہوسکتا؟۔

کچھ عرصہ بعد ایک تعلیمی کانفرس ''علم سب کے لیئے'' کا انعقاد کیا گیا۔اس پروگرام

میں سیاسی قائدین، سماجی شخصیات، معلمین، طلباء اور طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ سامنے صوفے پر سفید رنگ کی جوان سی لڑکی، سنہری بالوں، چست کپڑوں میں ملبوس تمام شرکاء کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ وہ کبھی سیاسی قائدین تو کبھی سماجی رہنماؤں سے گفتگو کرتی نظر آئی۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا! یہ لڑکی کون ہے؟

وہ میری جانب قدرے جھک کر بولا جناب! موصوفہ وہی تو ہیں۔

موصوفہ وہی تو ہیں؟...... مجھے سمجھ نہ آئی...... میں نے دوبارہ پوچھا......کون وہی......؟

اس بار اُس نے منہ کی بجائے آنکھ سے اشارہ کیا...... مجھے پھر بھی کچھ سمجھ نہ آئی...... وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں سب کچھ سمجھتے ہوئے محض بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک بار پھر استفسار کرنے پر اس نے کہا موصوفہ معمارِ قوم کہلاتی ہیں۔

نام کیا ہے؟ میں نے پوچھا تو اس نے قدرے غصے سے کہا......شازیہ ثاقب!

کٹے ہوئے خوب صورت سنہری بال، باریک جالی دار کالی قمیض، اُس کی سفید رنگت کو اور نکھار رہی تھی...... وہ محفل میں یوں نظر آ رہی تھی کہ جیسے چودھویں کا چاند اپنی چاندنی ہر سو بکھیر رہا ہو...... اُس کی گفتگو میں خوب صورت جملوں کا استعمال، چہرے کی مسکراہٹ، سفید چمکتے دانت، ہونٹوں اور ہاتھوں کی جنبش بھی اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کر رہی تھی...... وہ بڑے سلیقے سے چلتی۔ جس سے بھی گفتگو کرتی اُس کی آنکھوں کے راستے سیدھا دل میں اترنے کی کوشش کرتی...... واقعی وہ ہر لحاظ سے ایک شاہکار تھی...... محفل کو سب سے زیادہ دلکشی بھی تو اسی نے دے رکھی تھی......سیاسی قائدین، کارکن، اور کچھ سماجی شخصیات اُس سے کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہ رہے تھے۔ ہال طلباء و طالبات اور دیگر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج کے سامنے والی قطار میں معلمات ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے خاصی تعداد باپردہ خواتین کی تھی۔

میں نے تھوڑی دیر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں...... پروگرام شروع ہونے میں

نجانے کیوں تاخیر تھی۔ پھر ایک لڑکی سامنے سٹیج پر نمودار ہوئی۔

''خواتین وحضرات! ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالا اور آج کے پروگرام کو چار چاند لگائے'' ...... میں سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے کس نے چار چاند لگانے ہیں...... آج یہ کام تو صرف شازیہ ثاقب ہی کر رہی ہے۔

حسبِ روایت تلاوتِ کلامِ پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ حمد ونعت کے بعد ملی نغمہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کانفرنس میں تعلیم کے نام پر وہ کچھ بھی ہوا جسے دیکھ کر اکثر سامعین و ناظرین کے سر شرم سے جھکے جا رہے تھے...... جبکہ بعض نام نہاد اکابرینِ ملت خوب داد دیتے رہے۔ اسکول کی بچیوں کو ثقافت کے نام پر خوب نچایا گیا۔ ملی نغموں اور ٹیبلو کے نام پر بھی سکول کی بچیوں نے ناچ ہی پیش کیا۔

میں نے اپنے دوست کے کان میں سرگوشی کی۔

کیا ہمارا تعلیمی نظام بس یہی رہ گیا ہے؟

وہ زیرِ لب مسکرایا اور میرا ہاتھ دبا کر سٹیج کی جانب دیکھنے لگا۔

پھر لایعنی اور بے مقصد تقاریر کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ شازیہ ثاقب وقفے وقفے سے اسٹیج پر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آ کر مقررین کو دعوتِ کلام دیتی رہیں۔

تقاریر کے بعد اختتامی لمحات میں شازیہ ثاقب نے تمام اسکولوں، ان کی معلمات اور طالبات کو خراج تحسین پیش کیا جنہوں نے انتہائی محنت سے آج کے پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد ایم این اے محمد علی اور ایم پی اے عمران اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس پروگرام میں شرکت کی۔ ایم پی اے صاحب نے بھی تمام معلمات، طالبات اور بالخصوص شازیہ ثاقب کی ان تھک کاوشوں کو سراہا۔

صدارتی تقریر کے لئے ایم این اے محمد علی صاحب کو بلایا گیا جنہوں نے اپنی

تقریر میں حسرت سے کہا کہ اگر شازیہ ثاقب جیسی کچھ خواتین اُن کو میسر آ جائیں تو وہ پورے علاقے میں ایک انقلاب برپا کر دیں۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا......کیسا انقلاب؟؟ اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے نجانے کیا کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ پایا۔

چندروز بعد اخبار کے صفحہ اول پر تین کالمی شہ سرخی لگی ہوئی تھی......

''شازیہ ثاقب اور ایم این اے ہوٹل سے رنگے ہاتھوں گرفتار!''

بیٹی

عبدالرشید نے چار پانچ بار دکاندار کو تاکید کی کہ تکیے، رضائیاں اور تلائیاں خوب صورتی اور سلیقے سے سلوائی جائیں۔دکاندار یہی جواب دیئے جارہا تھا کہ آپ فکر نہ کریں کام میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

عبدالرشید دکان سے نکلتے ہوئے پھر یاددہانی کروا کے سڑک پر جا پہنچا۔وہ بہترین لکڑی سے بنا فرنیچر خریدنا چاہتا تھا۔کئی بڑی دکانوں پر مختلف اقسام کا فرنیچر دیکھنے کے بعد بھی اُس کی تسلی نہ ہوئی تھی۔دو چار سڑکیں عبور کرنے کے بعد وہ شہر کی سب سے بڑی فرنیچر کی دکان پر جا پہنچا۔سلام دعا کے بعد دکاندار سے کہنے لگا۔

جناب مجھے جدید نقش ونگار اور اعلیٰ معیار کا تیار کردہ فرنیچر دکھائیں۔

دکاندار نے عبدالرشید کی بات سن کر ملازم کو آواز دی۔

''پپو......او پپو......!''

ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا۔

''جی جناب!''

انہیں کارخانہ لے جاؤ...... پپو عبدالرشید کو لے کر کارخانے کی جانب چل پڑا۔دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد عبدالرشید شہر کے فرنیچر کے سب سے بڑے کارخانے میں کھڑا تھا۔جہاں ہر رنگ اور ہر قسم کا فرنیچر اپنی خوبصورتی اور جاذبیت سے دیکھنے والے کی توجہ اپنی جانب مائل کروا رہا تھا۔عبدالرشید نے کاریگروں سے کئی سوالات پوچھنے کے بعد بہترین نقش ونگار سے مزین جدید طرز کا فرنیچر پسند کرلیا۔وہ معاملات طے ہونے پر دکاندار کو رقم ادا کر کے بے حد خوش تھا۔

پھر وہ دوسرے بازار کی جانب چل دیا...... جہاں سے اُس نے ضروریاتِ زندگی کا دوسرا سامان خریدنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی......عبدالرشید کی بہن نے سامان کی خریداری میں اپنے تجربات بھی عبدالرشید کے گوش گزار کیے۔

جب ٹرکوں پہ سامان لادا جا رہا تھا تو عبدالرشید نے ڈرائیوروں سے التجا کی کہ سامان احتیاط کے ساتھ لے جایا جائے۔کوئی چیز ٹوٹنے نہ پائے......شام کے وقت دونوں بہن بھائی گھر جا پہنچے۔ بیوی اور بھانجیاں انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

ٹرکوں سے سامان اتارا جا رہا تھا کہ عبدالرشید کی بیوی نے اپنے خاوند اور نند پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔عبدالرشید ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا جبکہ اُس کی بہن تفصیلات بتا رہی تھی۔وہ بیوی کی جانب دیکھ کر بولا۔

''سب لے آئے ہیں تو کیوں پریشان ہو رہی ہے......؟''

سامان اتر چکا تھا اور اب ٹرک واپس جا رہے تھے۔

گھر کے برآمدے میں بچھی چارپائی پر چت لیٹے ہوئے جب اُس نے آسمان کی جانب دیکھا تو اُسے ستاروں کے وسیع حصار میں دَمکتا چاند اُداس اُداس دکھائی دے رہا تھا......وہ پہلو بدل رہا تھا مگر اُس کی نظریں آسمان کی وسعتوں، ستاروں کی چمک اور چاند کی روشنی کے سحر میں کہیں گم تھیں۔

عبدالرشید......او! عبدالرشید!!

انور بی بی اُسے سوچوں کی وادی سے واپس لے آئی......انور بی بی دھیمے لہجے کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس نے زندگی میں کبھی کوئی گلہ شکوہ نہ کیا تھا......وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی مگر اکیلے پن کے باوجود مٹھاس اُس کے لہجے اور رویے میں بھری پڑی تھی......عزم واستقلال کا حسین مرقع تھی۔وہ کافی دیر تک بیوی کے چہرے پہ نظریں جمائے نجانے کیا تلاش کرتا رہا۔

وہ گویا ہوئی......

’’تھک گئے ہو؟‘‘

’’ہاں......‘‘

اُس نے بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

’’میں خود تمہارے ساتھ جاتی مگر......‘‘

عبدالرشید نے مڑ کے انور بی بی کی جانب دیکھا......

’’خیر ہے کوئی بات نہیں......ساری زندگی میرا ساتھ جو دے چکی......انسان آخر کب تک......کب تک ایک جیسا رہتا ہے؟......کام ہو گیا......اللہ نے مدد کی......اچھا ہوگا......بس تُو......دعا کیا کر......بس دعا......‘‘

انور بی بی نے محبت بھری نظروں سے خاوند کی جانب دیکھا اور بولی۔

’’کاش!......‘‘

’’نہ......نہ......بس رہنے دے!......اب دِل خفا کرنے والی باتیں نہ کر! اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر کرتا ہے......انسان سمجھ نہیں پاتا......‘‘

عبدالرشید نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

انور بی بی بولی۔

’’اُس کے خزانوں میں کمی تو نہ تھی؟‘‘

عبدالرشید بولا۔

’’اُس نے دو بیٹے دیئے تھے......اور اُسی نے واپس لے لیے......دُعا کرو! ہماری بیٹی سکھی رہے......شاد رہے......آباد رہے......بس! ہم تو یہی چاہتے ہیں ناں......!‘‘

انور بی بی گویا ہوئی۔

’’ہماری بیٹی پڑھی لکھی ہے۔ گھر کا کام کاج ہو یا دستکاریاں......ماشاءاللہ سب جانتی ہے‘‘۔

پھر وہ دن بھی آیا جب ۵ مارچ کی رخصتی مقرر ہوئی۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔عبدالرشید کا بہنوئی، بہن، بھانجے، بھانجیاں رشتے دار سب ہی تو آئے ہوئے تھے۔سب نے عبدالرشیداور انور بی بی کی ڈھارس بندھانے کے لیے دعائیہ جملے گوش گزار کیے۔جن سے کسی قدر اُنہیں حوصلہ ہوا......آج جب اُن کی بیٹی عائشہ کی ڈولی اٹھی تو سب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔عائشہ کا رکھ رکھاؤ، گفتگو، باتیں اور تعلقات پورے محلے کی خواتین حتیٰ کہ بچیوں سے بھی تھے......سب اس کی جدائی پر افسردہ تھے۔

عبدالرشیداور انور بی بی حیرت اور استعجاب سے ڈولی نکلتے دیکھ رہے تھے۔ان کو بیٹی کا گھر بس جانے کی خوشی بھی تھی اور جدائی کا غم بھی......عبدالرشید بار بار آسمان کی جانب دیکھتا اور دھیمے لہجے میں بیٹی کے سکھ کے لیے دعائیں مانگتا......خاوند بیوی ایک دوسرے کو سہارا دینے کی ناکام کوششیں کرتے مگر سچ تو یہ تھا کہ دونوں آج بیٹی کی جدائی سے رنجیدہ بھی تھے۔آج انہیں جتنا نرینہ اولاد کی کمی کا احساس ہوا......شاید زندگی بھر نہ ہوا ہوگا۔

عبدالرشید نے انور بی بی سے کہا۔

’’کاش! آج ہمارا کوئی بیٹا بھی ہوتا، جو بہن کی ڈولی کو اپنے کندھے پر اٹھاتا‘‘۔

یہ الفاظ سننا تھے کہ انور بی بی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ عبدالرشید بولا۔

’’دیکھو ناں!......! آج ہمارا گھر کتنا سونا ہو چکا ہے‘‘

’’بیٹیاں رکھنے کے لیے تو نہیں ہوتیں......ورنہ ہم اپنی عاشی کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے نہ دیتے۔بس دعا ہے......اللہ اُسے اپنے گھر میں سکون دے‘‘۔ انور بی بی نے کہا۔

عبدالرشید نے آمین کہتے ہوئے اپنی چادر آنکھوں پہ رکھ لی۔

دو دِن کیا گزرے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔عبدالرشید اپنی بھانجی کے ہمراہ عائشہ کو

لینے اُس کے گھر پہنچا۔آج عائشہ کو والدین کے گھر آئے سات دن گزر چکے تھے۔ یہ سات دن صرف سات لمحے ثابت ہوئے۔وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب عائشہ کو پھرالوداع کہنا پڑا۔آج پھر گھر میں ویرانے کا سا سماں تھا۔بیٹی کی شادی کے بعد انور بی بی کے ساتھ ساتھ عبدالرشید بھی بیمار رہنے لگا۔کبھی کبھار بہن، بھانجے، بھانجیاں آ جاتے۔شادی کو ایک سال سے اوپر کا عرصہ گزر چکا تھا۔عاشی کے سسرال والے اُس کی بے حد قدر کرتے۔خاوند کا رویہ بھی مثالی تھا۔

عبدالرشید بازار سے سودا سلف لے کر جب واپس آیا تو اُس کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔بھیڑ میں کچھ عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔عبدالرشید کو دیکھتے ہی کئی پڑوسی اُس کی جانب لپکے۔ایک دوست نے اُسے اپنے دل سے لگا لیا۔وہ صورت حال سمجھنے سے یکسر قاصر تھا......اُس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

”میاں عبدالرشید! اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نواسا دیا ہے مگر...... بیٹی واپس لے لی ہے......“

اور پھر وہ بھی سکون کی وادی میں اُتر گیا۔

پاگل

میں سامنے والی گلی کے موڑ پہ پہنچا ہی تھا کہ ہاہا، ہو ہو اور شور نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ایک جانب بھیڑ لگی تھی اور کچھ فاصلے پر مجھے ایک سفید رنگت، بھورے بکھرے لمبے بالوں، بے ترتیب کٹی مونچھوں، نیلی چمکتی آنکھوں، قمیض کی کھلی پھٹی آستینوں، گندگی سے لتھڑے بدبو سے بھرے، ہوا میں تعفن پھیلاتے کپڑوں میں ملبوس شخص ہاتھوں میں پتھر اٹھائے گالیاں دیتا ہوا نظر آیا......وہ کبھی تو منہ ہی منہ میں منمناتا تو کبھی بڑبڑاتے ہوئے ادھرادھر بھاگتا۔پھر ایک دم سے رک جاتا ،آسمان کو غور سے دیکھنے کے بعد،سورج پہ ٹکٹکی باندھ لیتا۔۔کچھ شریر سے لڑکے اس پر طرح طرح کی آوازیں کستے، کچھ اس پر پتھر برساتے تو کچھ گندے شلغم اور ٹماٹر پھینک دیتے تھے۔

پاس سے گزرتا کوئی شخص جب لڑکوں کو منع کرتا تو وہ کچھ دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاتے مگر پھر اس کے پیچھے ہو لیتے......مرد اور عورتیں کتراتے ہوئے اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔مجھ سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا اور میں نے بھیڑ میں رکی گاڑیوں کے عقب نکل کر گھر کی راہ لی۔گھر پہنچ کر بھی اس شخص کا چہرہ میری نظروں کے سامنے ہی گھومتا رہا۔

شام کو حسبِ معمول میں چہل قدمی کے لیے نکلا تو وہی شخص ریلوے اسٹیشن کے پاس ویسی ہی حرکات کرتا نظر آیا۔وہ کبھی سورج کو دیکھتا تو کبھی خلاؤں میں گھورنے لگتا،منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور پھر گالیاں بکنے لگتا۔کچھ دور تک بھاگتا اور یک دم رک کے اِدھر اُدھر پتھر پھینکنے شروع کر دیتا۔میں کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

میرے قریب ہی دو بزرگ آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ سنا ہے بے چارہ بہت بڑا افسر تھا مگر ساتھی افسروں کے حسد اور بغض کی بھینٹ چڑھ کر دماغی توازن ہی کھو بیٹھا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا۔ پاس ہی ایک کھوکھے والا کسی گاہک سے کہہ رہا تھا۔

''جناب! یہ سب عشق کا شاخسانہ ہے۔ بیچارے نے سچی محبت کی ......مگر عورت ذات کے مکروفریب سے نابلد تھا......وہی ہوا جو آج کل کی لڑکیاں کرتی ہیں......بس دل پہ ایسی چوٹ لگی کہ دماغ خراب ہو گیا......''

میں ٹہلتا ہوا کچھ آگے بڑھ گیا۔ سامنے میدان میں کچھ لڑکے فٹبال کھیل رہے تھے اور کچھ تماشائی بھی تھے...... میں لڑکوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ جب کھیل ختم ہوا تو میں واپس ہو لیا۔ واپسی پر وہ شخص میدان سے قدرے دور شلوار اُتارے کھڑا تھا۔ وہ شلوار کو اُلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہا تھا......وہاں بھی کچھ شرارتی لڑکوں نے اُسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے لڑکوں کو سختی سے منع کیا۔

''خبردار......خبردار! اسے کوئی بھی تنگ نہ کرے''۔

انہی میں سے ایک بولا ''اوے! اللہ کی یاد میں ہے......''۔

مگر وہ گالیاں بکتا بازار کی جانب چل دیا......

اُسی شام میں جب ایک ہوٹل پہ چند دوستوں کے پاس پہنچا تھا تو موضوعِ گفتگو وہی شخص تھا......ثاقب سب کو چائے پیش کر رہا تھا کہ تنویر نے پوچھا۔

''آج اُس پاگل کو کسی نے دیکھا؟''

کون پاگل؟ وہی جو صبح بازار میں، دوپہر کے وقت چوک میں اور شام کو میدان کے پاس کھڑا تھا......تنویر نے سب کے چہروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں! میں نے دیکھا ہے.....مگر وہ کون ہے.....؟ ثاقب نے تنویر سے پوچھا۔
پاس بیٹھے سعید علی نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
''یہ کون سی نئی بات ہے.....ہمارا شہر تو سب پاگلوں کا آخری مسکن ہے
.....آخری مسکن ہے، وہ کیسے؟ تنویر نے پوچھا۔

سعید علی تنویر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا'' جناب! ہمارا شہر ریل گاڑی کا آخری اسٹیشن ہے، ہر شہر سے پاگل ریل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں ریل رات کو پہنچ آتی ہے اور صبح واپسی ہوتی ہے۔ یہ ریل سے اتر کر شہر میں گشت کرنا شروع کر دیتے ہیں.....اسی لیے ہمارے ہاں پاگلوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے''۔

''سنا ہے کارخانوں اور وسیع اراضی کا مالک تھا بس نقصان ہوا تو دماغی حالت خراب ہو گئی''.....ثاقب گویا ہوا

ہاں .....ہاں! جب ایسی حالت ہو جائے تو پھر کون کسی کا ہوتا ہے؟ بیچارہ دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے.....سعید علی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''صبح میں سبزی منڈی سے واپس آ رہا تھا تو وہ منڈی کے سامنے گندگی کے ڈھیر پہ لیٹا ہوا آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔سعید نے مزید بتایا۔

کافی دیر تک وہی شخص موضوعِ سخن رہا۔

کوئی کہتا مالی نقصان کی وجہ سے دماغ خراب ہوا.....کوئی بولا گھر والوں کی عدم توجہی سے دلبرداشتہ ہوا.....کوئی کہتا سارا خاندان جھگڑے کی بھینٹ چڑھ گیا.....کوئی افسردہ لہجے میں کہتا .....سارے گھر والے کسی حادثے کا شکار ہوئے.....کوئی محبت ،عشق تو کوئی دولت اور جائیداد .....کوئی کیا کوئی کیا..... جتنے منہ اتنی ہی باتیں.....جتنی باتیں اتنی کہانیاں.....جتنی کہانیاں اتنے ہی فسانے۔

نجی کام کے سلسلے میں مجھے دو دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑا۔ جب واپسی ہوئی تو پتہ

چلا کہ وہ پُل سے نیچے گر گیا ہے۔ یہ بھی سنا کہ اس نے خود چھلانگ لگائی تھی۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا جہاں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔

اگلے دن مقامی اخبار کے صفحۂ اول پر اس کی تصویر آویزاں تھی۔ کسی سماجی تنظیم کی طرف سے اشتہار بھی لگایا گیا تھا کہ جو کوئی اس شخص کے بارے میں کچھ جانتا ہو وہ درجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کرے،......دیکھا دیکھی کئی سماجی اور رفاعی تنظیمیں حرکت میں آ گئیں مگر وہ دوسرے دن ہی مر گیا......اُسے لاوارث قرار دے کر مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ایک مقامی تنظیم دھن کی پکی نکلی۔ اُس نے تمام تفصیلات ڈھونڈ نکالیں۔ تنظیم کے صدر نے اخبارات کو تمام تفصیلات فراہم کر دیں۔ عوامی اور سماجی حلقوں کے لگائے گئے تمام اندازے اور قیافے غلط ثابت ہوئے۔ اخبار کے مطابق وہ ایک قاتل اور اشتہاری مجرم تھا جس نے ایک لڑکی کا آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ لوگ اخبار کی تفصیلات پڑھنے کے بعد زمین کو ہاتھ لگاتے اور کانوں کو چھوتے ہوئے پائے گئے۔

پانچ کا پینتالیس

سخت گرمی تھی۔ بازار سنسان، گلیاں ویران تھیں۔گلی میں نسوانی آواز بلند ہورہی تھی۔

''پتیسے لے لو......پتیسے لے لو......ٹین ڈبے لے آؤ......ردی اخبار لے آؤ......''

میں سونے کی کوشش کررہا تھا۔دل میں سوچنے لگا''بھلا یہ کون سا وقت ہے ٹین ڈبے اور ردی اخبار کا......عجیب عورت ہے نہ خود آرام کرتی ہے اور نہ ہمیں آرام کرنے دیتی ہے......''۔

میں نے کروٹ بدلی......آواز نزدیک سے نزدیک تر ہوتی محسوس ہورہی تھی......پھر کوئی دروازہ کھلا اور دڑام دڑام کی بے ڈھنگی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے اس گھر کے مکینوں پر بھی غصہ آنے لگا۔بھلا یہ کون سا وقت ہے ٹین ڈبے فروخت کرنے کا؟

ایک بار پھر ڈز ڈز کی آوازوں نے بے چین کر دیا۔شاید ڈبوں کو توڑا جارہا تھا۔ان آوازوں نے عجیب سی بے چینی پیدا کر دی۔دل ہی دل میں دونوں کو خوب سنائیں......کروٹیں بدل بدل کے بھی جان نہ چھوٹی تو میں اُٹھ کر گلی میں جا کھڑا ہوا۔

ایک دروازے کے سامنے گندمی رنگ، لمبے قد، سیاہ بالوں، گہری کالی آنکھوں اور پُرانے سے کپڑوں میں ملبوس درمیانی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ میں گھر کی چوکھٹ پہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ کب اس کا کام ختم ہو اور یہ محلے سے باہر نکلے تاکہ میں جا کر سکون کی نیند سو سکوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر سے کچھ بچے باہر آئے۔ان کے ہاتھوں میں ایک ایک روپیہ تھا۔ بچے اس عورت کے پاس آ کر اس سے پتیسے لینے لگے۔اس نے اپنی ٹوکری پر سے میلی سی چادر ہٹائی اور تھوڑا تھوڑا پتیسہ اخبار کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاغذ پہ رکھ کر بچوں کے

حوالے کیا۔ بچے مزے لے لے کر کھانے لگے۔ مجھے ان بچوں پر بھی بے حد غصہ آیا۔ بھلا یہ کون سا وقت ہے پتیسہ کھانے کا؟

وہ عورت ٹین کا ڈبہ اٹھاتی اور اس پر پتھر برساتی......آواز اتنی کرخت اور اونچی تھی کہ محلے کے تمام سوئے ہوئے لوگ بیدار ہو چکے ہوں گے......دس پندرہ منٹ کے بعد اس عورت نے سارا سامان ایک بڑے سے تھیلے میں ڈالنا شروع کر دیا۔ اس دوران اُس نے دو تین بار میری جانب بھی دیکھا......

میں سوچ رہا تھا کہ اس کی شادی تو ہو چکی ہوگی......پھر اس کا خاوند کہاں ہے؟ خاوند کچھ کام کرتا ہوگا کہ نہیں؟ خاوند نے اتنا بوجھ اس کے سر پہ رکھ دیا اور تپتی دوپہر میں اسے گلی گلی ردی اخبار اور ڈبے لینے کے لیے بھیج دیا؟ اس طرح کے کئی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگے......اب مجھے اس عورت کی بجائے اُس کے خاوند پر غصہ آنے لگا......کس طرح کا بے غیرت شخص ہوگا؟......شرم نام کی کوئی شے اس میں ہے نہیں۔

جب وہ اپنا تھیلا سامان سے بھر چکی تو اُس نے اپنی قمیض کے نیچے پہنی بنیان میں سے بے ترتیب سے تڑے مڑے دس دس، پانچ پانچ، بیس بیس کے کچھ نوٹ نکالے۔ اُن میں سے کچھ پیسے گن کر سامنے والے گھر کی عورت کی جانب بڑھائے۔ عورت تیس روپے لینے پہ بضد تھی جبکہ یہ پچیس روپے دینے پہ مصر......لے دے کر اٹھائیس روپے میں سودا طے پا گیا۔

میں نے ارادہ کیا کہ اب جا کر سونا چاہیے مگر نیند جانے کہاں کھو چکی تھی......آنکھوں میں خمار اور جسم میں تھکاوٹ بدستور موجود تھی......میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی تو وہ عورت میری جانب دیکھنے لگی......میں شعوری طور پر دوسری جانب دیکھنے لگا تو اُس نے مجھے آواز دے دی۔ جب میں نے اُس کی جانب دیکھا تو وہ سامان اٹھا کر سر پہ رکھنے کی درخواست کر رہی تھی۔ پہلے تو میں نے انکار کر دینا مناسب سمجھا کیونکہ میرا پورا جسم نیند کے خمار اور بے زاری کی لپیٹ میں تھا اور ایسی حالت میں اتنا وزن اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر نجانے کیوں میں نے

جلدی سے سگریٹ کے دو چار کش لگائے اور اُس کی طرف چل پڑا۔ وہ پندرہ بیس قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں نے بمشکل اُس کے بڑے ٹوکرے کو اٹھا کر اُس کے سر پہ رکھوایا۔ اُس نے دوسرا تھیلا ہاتھ میں پکڑا اور چلنے لگی...... وہ مضبوط بدن کی عورت تھی اور قدم بھی ایک اٹھان سے اٹھاتی جا رہی تھی......اُس کے یوں وزن اٹھانے پر میں سوچنے لگا کہ اگر اتنا وزن مجھے اٹھانا پڑتا تو شاید مجھ سے نہ اٹھ پاتا...... مجھے دفعتاً اس مزدور کا خیال آیا جو بازار سے ہمارے لئے آٹے کا توڑا اٹھا کر لاتا تھا...... وہ بھی سوچتا ہوگا کہ آٹا کھاتے تو خود ہیں اور اٹھواتے مجھ سے ہیں...... میں وہیں کھڑا اُس عورت کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا تا کہ وہ محلے سے نکلے اور میں سو جاؤں۔

دوسرے دن حسبِ سابق اُس کی آواز نے پھر نیند غارت کر دی۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا اور دل ہی دل میں کہنے لگا...... یہ عورت ......کیسی عورت ہے......؟ نہ خود آرام کرتی ہے اور نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے......شاید یہ اِس معاشرے سے اپنی غربت کا حساب چکانا چاہتی ہے...... وہ بتا دینا چاہتی ہے کہ اگر میں آرام نہیں کروں گی تو پھر کوئی بھی آرام نہیں کرے گا...... وہ مجھے ایک ضدی عورت کے روپ میں نظر آنے لگی......اُس کی آنکھیں یاد آنے لگیں جن میں گہرائی تھی اور اِس گہرائی میں معاشرے کے عمومی رویے کے خلاف شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ پھر سوچا...... وہ حلال کمانے اور اپنے بچوں کو حلال کھلانے کے لیے محنت کر رہی ہے......اس کا ایک ایک قدم اس کی نجات کا ذریعہ بنے گا......

گلی میں اُس کی آوز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی...... ”ردی دو......اخبار دو......ٹین ڈبہ دو......“ اور ساتھ ہی ساتھ وہ پتیسے کی بشارت بھی سنا جاتی...... یہ تو چلتا پھرتا کباڑ خانہ ہے...... جہاں جو کچھ بھی لے کر جاؤ......خرید لیا جاتا ہے اور ساتھ میں پتیسہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ خیال ہی خیال میں اُس کا پیکر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

کوئی دروازہ کھلا......بچوں کی آوازیں آنے لگیں...... مجھے دو روپے کا...... مجھے ایک روپے کا......پھر قدرے خاموشی ہوگئی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر سے باہر گلی میں آ کھڑا

ہوا۔آج اُس کے پاس دوٹوکریاں تھیں۔ایک بڑی سی اوراُس کے اندرایک چھوٹی سی......چھوٹی ٹوکری میں پتیسے تھے جبکہ بڑی ٹوکری میں پُرانی اخبارات، رسائل وغیرہ کا انبارتھا۔گلی میں کل کی نسبت آج کافی بچے جمع ہو گئے۔کوئی دوروپے تو کوئی تین روپے......اورکوئی پانچ روپے کا پتیسہ لے رہا تھا......اُس عورت کے پاس پتیسے سے بھری تین تھیلیاں ٹوکری میں پڑی تھیں۔وہ ایک تھیلی سے پتیسہ نکال کراخبار کےٹکڑوں پر رکھتی۔

بچے پتیسہ لیتے......شورمچاتے اوراُچھلتے کودتے گھروں کو جارہے تھے۔میں یہ سب دیکھ کرمحظوظ ہورہا تھا کہ سامنے والے گھر سے، جہاں کچھ روز ہوئے نئے کرایہ دارآئے تھے،ایک نوجوان سالڑکا باہرآیا۔اُس نے آتے ہی اس عورت کو بُری بھلی سنانا شروع کردیں۔

''اے!تمہیں شرم نہیں آتی......''

''کیوں کیا ہوا......؟''وہ بولی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بچوں کے شور سے جاگ گیا ہے، جو اتنا غصے میں دکھائی دے رہا ہے مگر جب وہ اس عورت سے مخاطب ہوا کہ''نکالو بچے کے باقی پیسے!''تو میں دلچسپی سے سننے لگا۔

''باقی کےکون سے پیسے؟''......عورت نے پوچھا۔

''تم نے بچے کو پانچ روپے کا پتیسہ دے کر پچاس روپے لے لیے ہیں......اور پوچھتی ہےکون سے پیسے''۔

وہ بچے کوغور سے دیکھنے لگی اور کچھ پریشان سی ہوکر بولی۔

''بابو جی! اِس بچے نے مجھے پانچ روپے ہی دیئے تھے۔اس کے پاس پانچ روپے کا نوٹ تھا جس کا میں نے پتیسہ دے دیا......''

''جھوٹ بولتی ہے......!!...... میں نے خود اسے پچاس روپے دیئے ہیں۔پانچ کا نوٹ کہاں سے آ گیا؟''......نوجوان غصے سے بولا۔

وہ اپنی اوڑھنی سے پسینہ پونچھنے لگی۔اُسے پریشانی میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا

کرے؟......اور نوجوان اس کے ساتھ بدستور بدتمیزی کیے جا رہا تھا۔ وہ اُس کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔

وہ قسمیں اٹھانے لگی......

''بابو جی! مجھے اللہ کی قسم......میرے بچوں کی قسم......مدینے کی قسم...... مکے کی قسم......

اس بچے کے پاس پانچ روپے کا ہی نوٹ تھا۔

''تم نوٹ نکالو......!''......وہ نوجوان قدرے زیادہ بدتمیزی سے بولا۔

میں بڑے غور سے یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو بابو جی! مجھ پر چوری کا الزام مت لگاؤ۔ اگر پیسے ہی لینے ہیں تو یہ لے لو......''

اُس نے اپنی قمیض کے نیچے پہنی بنیان سے سارے نوٹ نکال کر ٹوکری میں رکھ دیئے......ٹوکری میں رکھے پیسوں میں پچاس کا نوٹ سرے سے تھا ہی نہیں......

''بابو! دیکھ لو اِن میں پچاس کا نوٹ تو ہے ہی نہیں......''اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

''مجھ سے زیادہ چالاکی کرنے کی کوشش مت کرو......''......نوجوان نے اُس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''شرم کرو بابو......!! یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے سارے پیسے تمہارے سامنے رکھ دیئے ہیں''...... وہ نوجوان کی حرکت پر احتجاج کر رہی تھی۔ مگر نوجوان نے اُس کی باتوں کو اَن سنی کرتے ہوئے اُس کی قمیض کے نیچے والی بنیان کے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

جب کچھ نہ ملا تو وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''اچھا......اب سمجھا! تم نے پیسے کہاں چھپا رکھے ہیں؟''

نوجوان کے الفاظ سن کر اُس کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''نہیں بابو جی......ایسی کوئی بات نہیں؟''

''اچھا...... مجھے دکھاؤ تو سہی......''......نوجوان چھیڑ خانی پہ اُتر آیا۔

جب صورتحال پریشان کن ہوگئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اِس مسئلے میں شامل ہوگیا......میری مداخلت پرنو جوان تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔

گلی میں کھڑے ہوئے بچے سارا جھگڑا بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس نو جوان کو اپنا تعارف کرایا مگر وہ کوئی بات بھی سننے کو بالکل تیار نہ تھا۔ اُس نے تو مجھے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے لہٰذا میں اپنی ٹانگ نہ اڑاؤں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

میں خود بھی اِس مسئلے میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا......لیکن ایک غریب عورت کو یوں بے عزت ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا......وہ لڑکا بار بار اُس کی جانب ہاتھ بڑھاتا اور وہ قدرے پیچھے سرک جاتی۔ بچے آپس میں سرگوشیاں کرتے اور بعض ہنسنے بھی لگے تھے۔عورت چاہتی تھی کہ میں اُس کی خلاصی کراؤں مگر میں بھی کسی تماش بین کی طرح صرف دیکھے جارہا تھا۔

وہ قدرے غصے میں چلاتے ہوئے بولی۔

''بس بابو......بس! چھوڑو مجھے تنگ نہ کرو......ان پیسوں میں سے اپنے پینتالیس روپے اٹھالو......''۔

''ٹھیک ہی تو کہتی ہے......آپ اپنے پینتالیس روپے پورے کرلیں''......میں نے کہا تو اس نو جوان نے ٹوکری میں رکھے پسینے سے نم آلود اور مڑے تڑے نوٹوں کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ جب اُس نے اپنے پینتالیس روپے پورے کر لیے تو ٹوکری میں صرف ریز گاری بچ گئی۔ جو شاید گیارہ یا بارہ روپے سے زیادہ نہ تھے۔عورت نے اپنی ٹوکری اٹھائی، سر پہ رکھی اور چل دی۔ میں اُسے تھکے تھکے اور نِڈھال قدموں سے دور تک جاتے ہوئے تا دیر دیکھتا رہا۔

۔۔۔۔۔۔۔کتے۔۔۔

آسمان پر چمکتا سورج غروب ہو رہا تھا۔ روشنی سرخ لباس پہن چکی تھی اور سرخی نیلاہٹ اور نیلاہٹ سیاہی میں بدل رہی تھی۔ ہر چیز کو اندھیرے نے اپنے دامن میں بھرنا شروع کر دیا تھا......فضاء میں اڑتے پرندوں کی آوازوں میں عجیب سی بے چینی تھی۔ وہ اپنے گھونسلوں کی جانب پلٹ رہے تھے۔ پرندے روشنی کو اندھیرے میں بدلتا دیکھ کر کچھ بے سکون سے لگتے تھے......گلی کی نکڑ پر کتے بھونک رہے تھے۔ بند مارکیٹ کے سامنے دو تین آوارہ کتے کتیا کی جانب غراہٹیں بھر رہے تھے......کبھی تیز، کبھی آہستہ، کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی آگے اور کبھی پیچھے وہ کتیا کے ساتھ اس بازار میں دُور تک بھاگتے جا رہے تھے۔

چوک کے وسط میں بڑے سائن بورڈ پر کسی اداکارہ کی نیم عریاں تصویر دکھائی دے رہی تھی......فلک بوس ہوٹل، قمقموں میں جگمگ ملحقہ شاپنگ پلازہ روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ چوک میں سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، کاروں اور رکشوں کا ایک سیلاب رواں تھا۔ ٹیوشن سے فارغ ہونے والے لڑکے لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی جانب بڑھ رہے تھے ۔ جب اُن کا گزر سائن بورڈ کے پاس سے ہوا تو کچھ لڑکے تصویر کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے بعد آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔ لڑکیاں اس بھیڑ سے پہلو بچاتی آگے بڑھ رہی تھیں ۔ان میں سے بعض کنکھیوں سے سائن بورڈ کا جائزہ لیتیں اور ساتھی سہیلیوں کے کانوں میں کھسر پھسر کرتیں۔

باغ میں نئے جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوش گپیوں میں مصروف ٹہل رہے تھے۔ بعض ایک دوسرے کی انگلیاں پکڑے پھر رہے تھے۔ کئی چہل قدمی سے زیادہ پیش قدمی کر رہے

تھے۔ ہر عمر کے مرد وزن اپنی دُنیا میں مگن تھے۔بعض پھولوں کی کیاریوں کے پیچھے پیار ومحبت کی دُنیا میں گم تھے۔

ایک لڑکی بولی......واقعی؟

ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں......لڑکے نے جواب دیا۔

نہیں نہیں پلیز سچ بتاؤ......لڑکی اصرار کر رہی تھی۔

''بخدا! میں سچ کہہ رہا ہوں......''لڑکا لڑکی کے ہاتھ پکڑ کر اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر لڑکی نہیں مان رہی تھی۔

پھر وہ کہنے لگا''کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں''۔

لڑکی اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی''خوابوں کی دُنیا حقیقت سے کئی گنا خوب صورت اور پرسکون ہوتی ہے......''۔

لڑکی مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ لڑکا بولا۔''تم خوابوں سے بہت زیادہ خوبصورت ہو۔ تمہارے ساتھ گزارے لمحے میری زندگی کے پُرسکون اور قیمتی لمحے ہیں......'' جملے کی تکمیل کے ساتھ ہی اُس نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں بھرلیا......رات جوان ہو چکی تھی...... یہاں وہاں...... اِدھراُدھر......آگے پیچھے......اوپر نیچے...... ہرطرف لانبی......گھنیری......سیاہ زلفوں اور بدن کی مہک چاروں جانب پھیل گئی......

سامنے بڑی عمارت کے عقب میں موجود گھر بیماریوں کے حصار میں تھا۔ بوڑھا مرد دمہ کا مریض اور بوڑھی عورت دو قدم اُٹھانے کے قابل نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے دیتے زندگی کے سفر پہ گامزن تھے۔

فٹ پاتھ پر ایک بچی اپنی والدہ کی انگلی پکڑے والد کے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ جب کسی نئی چیز کو دیکھتی تو والدین سے خرید کر لے دینے پر استفسار کرتی۔ والد اُس کے سوالات سے تنگ ہو کر الٹے سیدھے جواب دیتا تو والدہ تصحیح کرتی۔ بچی دونوں کے جوابات میں الجھتی تھی کہ والد سچ

کہہ رہا ہے یا والدہ...... بچی دونوں کے چہروں کو حیرت سے دیکھتی۔

سینما ہال میں شو ختم ہو چکا تھا۔ جم غفیر ہال سے باہر، نیا ریلہ شو کے لیے ٹکٹیں لینے قطاروں میں کھڑا تھا۔ سینما سے قدرے دُور میک اَپ سے لدی، بنی ٹھنی، بال بنائے، چوڑیاں چھنکائے، چمکیلے پوشاک زیب تن کیے چند لڑکیاں نجانے کس کے انتظار میں سڑک کو گھور رہی تھیں......ان کے ساتھ موٹی توند، بڑی مونچھوں اور لمبے بالوں والا ان کے لئے جوڑ توڑ کی کوشش میں مصروف تھا۔ نوٹوں کا دھندہ عروج پر تھا۔ نوٹ ایک جیب سے دوسری جیب میں......ایک ہاتھ کا لمس لے کر دوسرے ہاتھ کا لمس لے رہے تھے۔

سینما کے پاس نصب ٹرانسفارمر کے نیچے عامل بابا درمیانی عمر کے شخص کو قسمت کا حال بتا رہا تھا۔ جوں جوں عامل بابا کچھ کہتا توں توں وہ مرد مسکراتا۔ اُس کے قدرے پیلے دانت دکھائی دے رہے تھے۔ عامل بابا کے بورڈ پر لکھا تھا...... ''لڑکی ،لڑکا ،عزت ، دولت ،شہرت کے لیے رابطہ فرمائیں۔ دس روپوں میں سب دیا جا رہا تھا۔ سینما میں داخل ہونے والے لوگ عامل بابا کے بورڈ کا جائزہ لینے کے بعد بابا سے مشورے کر رہے تھے۔ سینما کے سامنے دُکان سے کپڑے اور ساتھ والی مارکیٹ سے جوتوں کی خرید و فروخت جاری تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک شخص سگریٹ کے مرغولے چھوڑتا اپنی ہی دھن میں مگن خود کلامی کر رہا تھا۔ وہ شاید اپنے مسائل کا حل خود کلامی سے نکالنے کی سعی کر رہا تھا۔ ہوٹلوں سے مختلف کھانوں کی خوشبوئیں ہوا کے دوش پر اڑ کر ماحول کو مہکا رہی تھیں۔ شیشوں والے ہوٹل میں جگہ کا ملنا محال تھا...... ہوٹل کے سامنے کھڑا خوانچہ فروش بھی گاہکوں کے ہجوم کی وجہ سے بدحواسی کا شکار تھا۔

گلی کے ایک دروازے پر مسلسل گھنٹی بج رہی تھی مگر دروازہ کھولنے والا کوئی نہیں تھا۔ گھنٹی دینے والا گھڑی پر نظر جمائے کبھی خود کو تو کبھی گھر والوں کو گالیوں سے نواز رہا تھا......موٹے شخص کے ساتھ پتلا شخص کھسر پھسر کر رہا تھا۔ پتلے شخص نے گاڑی سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔

''جناب! مال بالکل تازہ، اِک دَم نیا اور فٹ ہے'' موٹے آدمی نے اپنی بھدی آواز میں کہا۔

پتلے آدمی نے اُس کی بات سنی اور سگریٹ کا دھواں ادائے بے نیازی سے ہوا میں چھوڑ دیا......موٹا دوبارہ مخاطب ہوا تو اُس کے الفاظ میں کئی نئے پہلو بھی تھے۔ پتلے شخص نے سگریٹ پھینک کر چھاتی پہ ہاتھ مارتے ہوئے آہستگی سے قدم آگے بڑھائے......سودا طے ہو جانے پر پتلا شخص نیا سگریٹ سلگا کر آنکھوں کے اشاروں میں بات کرتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھ گیا......گاڑی مزید سواریوں سے لد چکی تھی۔

فٹ پاتھ کے ایک جانب کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بیمار گھر کے باسی وقفے وقفے سے کھانسے جا رہے تھے۔ بیماریوں نے زور پکڑ لیا تھا......ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا مرد سامنے کھڑی لڑکی کو بال کھولنے پہ اصرار کر رہا تھا جبکہ لڑکی بال کھولنے پہ رضا مند نہ تھی۔ فضا میں کثافتیں شامل ہو چکی تھیں اور ہوا قدرے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

درد سے کراہتے لوگوں کے دردوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا......سینما کے پاس کھڑی لڑکیاں جا چکی تھیں......محفلیں سج رہی تھیں......کئی بدن لباس سے عاری......کئی ہوش مند مدہوشی کے قریب......اور کئی جوان بدن تھرتھرانے کو بے تاب تھے۔

گوشت مارکیٹ سے نکلنے والا کتوں کا لشکر بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ سب سے آگے کتیا بھاگ رہی تھی اور بہت سے کتے غراہٹیں بھرتے پیچھے پیچھے بھاگے جا رہے تھے......رات کی تنہائی اور گہری خاموشی میں کسی کتے کی غراہٹ دور تک سنائی دے رہی تھی۔

نڈھال بدن اپنی خوشبوؤں میں بدبو کی آمیزش سے داغدار ہو چکے تھے......فٹ پاتھ پر سونے والے آدھی نیند کر چکے تھے......جسم جسم سے ٹکرا چکے...... کتے بھونک بھونک کر اور رال ٹپکا ٹپکا کر تھک چکے تھے......شفاف ہوا میں جس قدر تعفن پھیلنا تھا پھیل چکا......روشنیوں میں جگمگ جگمگ ہوٹل اپنی جگمگاہٹ کھو چکا تھا......روشنیوں میں نہایا ہوا شاپنگ پلازہ سیاہی کی آغوش میں ڈوب چکا تھا......سیاہی نے ہر شے پر اپنی حکمرانی ثابت کر دی......رات نے اپنا بھیانک چہرہ سب کے سامنے بے پردہ کر دیا تھا......فضا کو معطر کرتی خوشبوئیں زائل ہو گئیں۔ زلفوں کی پہلی

جیسی اٹھان غارت ہوگئی...... بدن چھو لینے پر اضطراب ختم ہو چکا......اب خمار چڑ چڑاہٹ میں بدل رہا تھا......کانپتے ہونٹوں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا......جس کی جو قیمت تھی اُس نے اپنی قیمت وصول کر لی تھی...... پہلے دوریاں نزدیکیوں میں......اب نزدیکیاں بے پروائی کی صورت اختیار کر چکی تھیں ۔ بیماروں کی بیماری میں قدرے افاقہ محسوس ہونے لگا۔کئی درد ختم ہو چکے......رات اپنی منزل طے کر چکی۔کائنات نے انگڑائی لی...... ہر طرف خاموشی اور گہرا سکوت تھا کہ اتنے میں ایک آواز سنائی دی......جس سے اونچی اور کوئی آواز نہ تھی......وہاں سے صرف اللہ اکبر کی صدائیں کانوں میں رس گھولنے لگیں......روشنی نے سیاہی کو نیلے ملجگے میں بدلنا شروع کر دیا...... پرندوں کی آوازوں میں عجیب سرور و مستی تھی...... پرندے سرخوشی سے سرشار اللہ رب العزت کی حمد و ثنا بیان کر رہے تھے اور کتے اپنے ٹھکانوں پر گہری نیند و چکے تھے۔انکھ کھلی ۔۔۔۔

۔۔۔ میں نے دیکھا۔۔۔دنیا تو بے رنگ تھی۔۔۔

جب اُن کا جی چاہے گا

وہ تمہیں کب بلائیں گے؟ ماں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا

امی! کچھ روز تک بلا ہی لیں گے............طیب نے بیزاری سے جواب دیا

مگر کب؟

فائنل پراسس کے بعد......جب میرے کاغذات اور انٹرویو کی فائل پر سارا پینل دستخط کر دے گا مجھے بلا لیں گے۔ طیب نے تمام تفصیلات ماں کے گوش گزار کیں۔

کب آخر کب......؟ ماں نے ذرا خفگی کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔

ماں کے کانپتے ہاتھوں، لرزتے ہونٹوں اور چہرے پر عیاں غصہ دیکھ کر طیب نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

طیب کی ماں کافی عرصے سے گھریلو ذمہ داریاں اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی اور اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ وہ آج اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ ماں کا غصہ دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ماں ہے۔ جس نے اپنی بھرپور جوانی کے دنوں میں خاوند کی ناگہانی وفات کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر بہت سے رشتے ٹھکرا دیئے۔ اس نے دن رات لوگوں کے گھروں میں کام کیا اور اپنے بیٹے کے تعلیمی اخراجات پورے کرتی رہی۔ وہ ہر صبح اپنے بیٹے کو سکول جاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتی، دعائیں دے کر رخصت کرتی اور دوپہر ڈھلے بیٹے کی راہ تکتی رہتی۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر بیٹے کی سلامتی کے لیے نوافل پڑھنے کی منتیں مانتی۔

....

اخبار میں بھرتی کا بڑا اشتہار سارے ڈگری ہولڈرز بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ درخواست دینے والوں کے لیے درخواست کے ساتھ دو ہزار روپے بھی جمع کروانے ضروری تھے۔ طیب نے بھی درخواست بھیجی تھی۔ درخوستیں ارسال کرنے والے کئی خواب بننے لگے۔ سب اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے بے چین تھے۔ امیدواروں کے چہرے خوشی سے کھلے جا رہے تھے۔ سارے امیدوار نہا دھو کر، اجلے کپڑوں اور مسکراتے چہروں کے ساتھ ہاتھوں میں ڈگریاں پکڑے قطار میں کھڑے تھے۔ صدر دروازے پر کاغذات کی پڑتال کی جا رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر سیکیورٹی اہلکاروں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کالے، سفید اور بھورے رنگ کے قد آور کتے اپنی لمبی سرخ زبانوں، چمکتے دانتوں اور تیز آنکھوں سے امیدواروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ نوجوان انہیں دیکھ کر گھبراہٹ کا شکار بھی تھے۔

جونہی کوئی درخواست گزار چیکنگ سے فارغ ہوتا تو اُسے سامنے بڑے ہال میں بھیج دیا جاتا۔ ہال میں خوب صورت ٹائلیں، اطراف میں ماربل، چھت پہ جدید نقش و نگار، ایک جانب خوبصورت شیشے کی کھڑکیاں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ شیشوں سے منعکس سورج کی کرنیں پورے ہال کو روشن کیئے جا رہی تھیں۔ ہال میں بڑے سلیقے سے ترتیب دی گئی کرسیاں موجود تھیں۔ ہر کرسی پر آنے والے کا نمبر آویزاں تھا۔

ہال سے ملحقہ کمرے میں انٹرویو کے لیے تعینات افسران بیٹھے تھے۔ جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد باری باری امیدواروں کے نام اور نمبر پکارتے۔ ایک ایک امیدوار اندر جاتا۔ اُس سے ملکی حالات، موجودہ صورتِ حال، اسمبلی کی نشستوں کی تعداد، وزراء کے نام، خارجہ پالیسی اور پڑھے گئے مضامین کے بارے میں تفصیلی سوالات پوچھے جاتے۔ کچھ ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی اور امیدوار انٹرویو سے فارغ کر دیا جاتا۔

ہر انٹرویو دینے والا یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہنستا مسکراتا دل میں نوکری مل جانے کی اُمید بسائے ہال سے باہر نکل جاتا۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انٹرویو کے بعد کاغذات

کی چھان بین اور دیگر مراحل کے مکمل ہونے اور نتائج مرتب کرنے میں تین ماہ کی مدت کا بھی اعلان کیا گیا۔

انٹرویو دینے کے بعد جب سال بھر کسی بھی امیدوار کو کوئی اطلاع نہ دی گئی تو یہ افواہ بھی گردش کرنے لگی کہ تمام ملازمتوں پر تعیناتی انٹرویو سے ایک دن قبل ہی ہو گئی تھی۔ بعد کا ڈرامہ تو محض لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے رچایا گیا تھا۔

....

''اِس ملک میں ہر شخص معیار میں پھنسا ہوا ہے دیکھو نا! آج بھی میری فائل پہ دستخط نہیں ہوا......'' دفتر میں نچلے درجے کے ملازم نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''بھائی جان! دستخط اس وقت ہو گا جب اُن کا جی چاہے گا...... میں نے فائل مکمل کر کے دو دن قبل ہی اُن کی میز پہ رکھ دی تھی اب وہ چیک کر کے دستخط کر دیں گے......اور جلدی بھی کیا ہے فائل پراسیس کے تحت ہے چلے گی''۔اس کے ساتھی نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ملک بھلا کیسے ترقی کر سکتا ہے......'' پہلے نے مایوسی سے کہا۔

دوسرے نے اُسے تسلی دی اور سامنے سٹول پہ بیٹھے نائب قاصد کو چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔

....

پورے ملک میں آئے روز پے در پے دھماکے ہو رہے تھے۔کبھی کسی چوک میں تو کبھی پلازے میں......کبھی کہیں کبھی کہیں...... ہر شخص خوفزدہ تھا اور ایک بے یقینی کی فضا اور بے اطمینانی کی کیفیت نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔اس دوران عقل وخرد سے عاری اور حقائق سے نابلد افواہیں پھیلانے والوں میں بھی شامل تھے۔ اپنے تئیں یہ خدمتِ خلق کیے جا رہے تھے۔ بلاتصدیق باتوں کو آگے پہنچانا انہوں نے اپنی ذمہ داری بنا رکھی تھی۔حکومتی عہدیدار ٹی وی پہ صبر کی تلقین کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ بار بار یہی پیغام نشر ہو رہا تھا کہ صبر کریں اور قوم ظالموں

کامل کر مقابلہ کرے، والدین اپنے گمشدہ بچوں کو ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔ سامنے کھڑی گاڑیاں نیست و نابود ہو چکی تھیں۔ ان میں بیٹھے اور اِرد گرد کھڑے لوگ کوئلہ بن چکے تھے۔ کسی کی شناخت ممکن نہ رہی تھی، ٹی وی پر بار بار خبر چلائی جا رہی تھی، کیمروں کے سامنے بکھرے اعضاء دکھائے جا رہے تھے۔ خون میں لت پت لوگ کراہ رہے تھے، ہر جانب کہرام مچا ہوا تھا۔ کئی اپنے پیاروں کے غم میں نڈھال، ہر طرف صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی، حکومتِ وقت کے اہلکاروں کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ حکومت زخمیوں کی امداد اور مر جانے والوں کو بڑی رقوم دینے کے وعدے کر رہی تھی۔ گویا انسان کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی، لوگ سماجی اداروں اور فلاحی مراکز کے باہر شور مچا رہے تھے۔ وہ اپنے پیاروں کی تصاویر اٹھائے ہوئے تھے، ایک بڑا افسر جس کے کردار کا سب کو علم تھا ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر قرآن کی آیات بمع احادیث سنائے جا رہا تھا جس کا مفہوم تھا ”صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“ سامنے کھڑے لوگوں میں سے ایک گویا ہوا ”کیا یہ وہی ہے......؟“

ساتھ کھڑے آدمی نے کہا ”ہاں ہاں! یہ وہی ہے جس کا چند دن قبل اخبارات میں اسکینڈل شہ سرخی بنا تھا۔ اِس نے غریبوں کے خون پسینے سے اپنے پلازے اور محل نما کوٹھیاں بنائیں......“ دوسری جانب ایک شخص اپنے دوست کے کان میں کہہ رہا تھا ”شکر ہے آپ بچ گئے اور کار بھی سلامت رہی“ دونوں خوشی سے گلے مل رہے تھے۔ دونوں کی بتیسیاں باہر نکلتی نظر آ رہی تھیں۔ دونوں تیز قدموں سے ایک جانب چل دیئے، دھماکے کی جگہ سے قدرے دور عورتیں چھاتیاں پیٹ کر بین کر رہی تھیں، سر کے بال نوچے جا رہے تھے، مرد ایک جانب کھڑے زار و قطار رو رہے تھے، کسے دلاسہ دیا جائے، کس سے تعزیت کی جائے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کئی لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ٹی وی کے چینل بدل رہے تھے ایسے چینل کا انتخاب کیا جا رہا تھا جو لاشوں، کاروں، زخمیوں اور اُن کے عزیز و اقارب کو زیادہ دکھائے۔ گھر میں جو بھی داخل ہوتا گھر والے اُسے دھماکے کی تفصیلات سے برابر آگاہ کرتے اور اپنا تبصرہ بھی پیش کر دیتے۔ شہر کے تین بڑے

ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ دھماکے کے زخمیوں کو ایمبولینس کے ذریعے ہسپتالوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔کسی کی انگلیاں اُڑ چکی تھیں تو کسی کا ہاتھ غائب،کوئی اپنے کام پہ تیز قدموں سے گیا تھا مگر اب اپنی ٹانگ گنوا چکا تھا۔کئی بچے، بچیاں جن کے چہرے پر پھولوں کی سی لطافت تھی مگر اب وہ خوف سے سہمے ہوئے تھے۔وہ سامنے ایک خوبصورت ننھا بچہ اپنا بازو گنوا بیٹھا اُس کی چیخیں کانوں میں پڑتے ہی دل لرز گیا۔

کئی افراد نے دھماکے سے خاصی رقم اکھٹی کی وہ لاشوں کی جیبیں ٹٹولتے رہے۔کلائیوں سے گھڑیاں اُتارنا اور بٹوے خالی کر کے اپنی دیہاڑی لگانے میں مصروف تھے انہی کے کئی ساتھی دکانوں سے سامان اُٹھانے میں لگے تھے۔

وہ دن گزر گیا چند دنوں کے بعد ہسپتال کے عملے نے بھی مریضوں سے جان خلاصی شروع کر دی تھی۔اب مریضوں سے قدرے ترش لہجے میں باتیں کی جانے لگیں، کئی مریض ادویات بازار سے لانے پہ مجبور تھے۔پیسے والے اپنے مریضوں کو پرائیویٹ چیک اپ کرانے کے لیے لے گئے۔اسی ہسپتال کے سینئر ڈاکٹر زشام کے وقت پرائیویٹ کلینک بھی تو چلاتے تھے۔

پہلے پہل وزیر، مشیر، ممبران قومی وصوبائی اسمبلی میڈیا ٹیم کے ہمراہ آتے۔واقعے کی بھرپور مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ مدد کی یقین دہانی دلاتے پھر ان کا آنا بھی ختم ہو گیا، اب حکومت سے وعدے پورے کرنے کی چھوٹی سی خبر اخبار کے کسی کونے میں نظر آتی مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا...... وہ باتیں جو پہلے دن کی جا رہی تھیں، اکثریت بھول چکی تھی، اپنی چھاتیاں پیٹنے والیاں، بال نوچنے والیاں، بین کرنے والیاں حکومت کے اعلان کے مطابق صبر کر چکی تھیں۔ایک شخص افسردہ لہجے میں کہنے لگا ’’جو چلے گئے اُنہیں اب واپس نہیں آنا، بس دعائے خیر فرمائیں،‘‘ سب نے دعا کی اللہ اللہ خیر صلا......

....

میری آنکھوں کے سامنے گل فضا کا چہرہ گھوم رہا تھا......وہ واقعی گل تھی......مگر گل کی گل

فضا کے سامنے کیا حیثیت...... میں نے جب گل فضا کو دیکھا اُس میں پہلے جیسی کوئی بات نہ رہی تھی، اُس کا خاوند بھی اِسی دھماکے کی نذر ہو گیا تھا، اُس کی اکلوتی بیٹی بار بار اس سے پوچھ رہی تھی......امی جی......امی جی...... پاپا کب واپس آئیں گے......؟؟ بتائیں ناں......!! بچی کے اس سوال کا جواب ماں کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا...... پھر بچی ماں کے چہرے کو اپنے ننھے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہتی ''امی جی......آپ روکیوں رہی ہو......خاموش ہو جائیں ناں......میں اب آپ سے پاپا کا نہیں پوچھوں گی......''

حکومت کی جانب سے کچھ امداد ضرور دی گئی جو پراسس کے تحت ملنی تھی، قطار میں کھڑی طیب کی ماں ساتھ والی عورت سے پوچھنے لگی......ارے بہن! کیا ہماری فائلوں پہ دستخط ہو چکے ہیں......''

''بہن! افسر کم کم ہی دفتر میں آتے ہیں، آ بھی جائیں تو دستخط نہیں کرتے'' عورت نے مایوس لہجے میں جواب دیا

کیا وہ دستخط کریں گے......؟ طیب کی ماں نے پھر پوچھا

ہاں ہاں! ضرور کریں گے......عورت گویا ہوئی

مگر کب......؟ طیب کی ماں نے کانپتے ہاتھوں، لرزتے ہونٹوں اور تھکاوٹ سے بھرے لہجے میں دریافت کیا

جب اُن کا جی چاہے......عورت نے جواب دیا۔

چھوٹا

رات چھٹی بہت دیر سے ہوئی پھر سردی اور تھکاوٹ کی وجہ سے ساری رات بے خوابی کی کیفیت ہی رہی۔صبح ماں نے اندھیرے منہ اٹھا دیا اس کا پورا جسم تھکاوٹ سے چور چور اور آرام کا طلبگار تھا۔حسبِ دستور والدہ نے اپنا فریضہ سرانجام تو دے دیا مگر وہ حسبِ عادت آج اپنے فریضے کو سرانجام دینے سے قاصر تھا۔پتلی اوڑھنی اوڑھ کے سونے اور سخت سردی کی وجہ سے اس کا سر بوجھل اور جسم اکڑا ہوا تھا۔اس نے بادل نخواستہ ناشتہ کیا۔ماں جب بار بار اسے جلدی کام پرٗ نکلنے کی دہائی دے رہی تھی تو اسے دن کی تھکاوٹ اور ٹھنڈا پانی یاد آنے لگا۔سردی کی شدت اسے کام پر جانے سے بیزار کر رہی تھی۔اس کے سامنے پورے دِن کی مشقت گھومنے لگی۔جھوٹے گندے برتن اُٹھا کر ساتھ والے کچن نما کمرے میں لے کر جانا......کمرے کی ٹھنڈک، پانی کی ٹھنڈک،موسم کی ٹھنڈک......وہ یہ سب سوچتے ہی آنکھیں بند کر کے لمبی نیند سو جانا چاہتا تھا مگر ماں اصرار کر رہی تھی کہ جاؤ،،،،،جلدی جاؤ،،،،دیر ہو رہی ہے،،،،،،

وہ ماں کی طرف دیکھتا کبھی اپنی دن بھر کی مشقت اور تھکان کے متعلق سوچتا۔۔پھر وہ گھر سے باہر نکلا اور سیڑھی پر جا بیٹھا......وہ اپنے ہم عمر بچوں کو سکول جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔اجلے چہرے......گرم کوٹ......سویٹر......ٹوپیاں......صاف کپڑے......کاندھے پر بستہ لگائے لڑکے لڑکیاں تیز تیز قدموں سے اسکول کی جانب رواں دواں تھے۔تھوڑی دیر کے لئے اس کا جی چاہا کہ وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔پھر اس کی نظر سامنے بڑے ڈھیر پر جا ٹکی ،سرخ وسفید رنگت ......سرخی مائل آنکھوں......سنہری بالوں والی لڑکی اور لڑکا ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا مضبوط تھیلا لئے

گندگی کو کبھی پاؤں تو کبھی ہاتھوں سے اِدھر اُدھر کر کے اپنے مقصد کی کوئی نہ کوئی شے اٹھا کے تھیلے میں ڈال لیتے۔انھوں نے بھی چھوٹے کی طرح باریک اور پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے......جو سرد موسم کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی تھے۔

سانولی رنگت ، چہرے پر تھکاوٹ، کالی آنکھیں جو نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں......سیاہ لمبے بال مگر کنگھی نہ کرنے کی وجہ سے الجھے ہوئے...... ہاتھ میں ایک بڑا سا رومال جس میں چھوٹا روٹیاں اور سالن باندھ کے لاتا۔آج چھوٹے کا ہوٹل جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اوراوپر سے ماں گالیاں دیئے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ارے چھوٹے جا جلدی کر۔۔تم نے چھ بجے ہوٹل پہنچنا تھا......سات یہاں ہی بجا دیئے۔چھوٹا سنی اَن سنی کر رہا تھا...... جب ماں مسلسل کہنے لگی تو وہ گھر سے باہر نکل کر سامنے کی سیڑھیوں جا بیٹھا......دھوپ میں اُسے مزا آنے لگا۔

آدھ گھنٹے بعد ہی ماں چادر اوڑھے سر پر آن پہنچی۔۔۔۔ابھی تک یہاں ہی ہے اُٹھ جا ہوٹل۔۔۔۔ماں نے قدرے تُرش لہجے میں کہا۔

میں آج ہوٹل نہیں جاؤں گا ماں۔چھوٹا بولا۔

نہیں جائے گا تو کھائیں گے کیا۔ماں نے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے کہا۔

ماں مجھے نیند آئی ہوئی ہے۔چھوٹا بولا۔

خیر ہے بیٹا چلا جا۔ماں نے قدرے محبت سے سمجھایا۔

وہاں بہت کام اور سردی ہوتی ہے ماں،،،،چھوٹا رونے کو تھا۔

بیٹا بس! آج جلدی آ کر خوب سونا۔ماں نے محبت سے بیٹے کے چہرے پہ نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔

چھوٹا نہ چاہتے ہوئے بھی ہوٹل چل دیا۔پانچ افراد پر مشتمل یہ خاندان کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔چھوٹے کی ماں ، چھوٹا اور تین بڑی بہنیں۔والد تین سال قبل دنیا سے منہ موڑ گیا۔ساری ذمہ داری چھوٹے کے کندھوں پہ آن پڑی۔ماں بھی محلے کے دو گھروں میں برتن

مانجھتی، کپڑے دھوتی، جھاڑو لگاتی......مگر مہنگائی کے سیلاب میں کہاں پوری پڑتی۔ چھوٹا سب کا چھوٹا تھا۔ گھر، محلے اور ہوٹل والے اسے چھوٹے کے نام سے ہی جانتے پہچانتے۔ ماں چاہتی تھی کہ پڑھ لکھ جائے مگر گھر کا چولہا بھی جلانا تھا......وہ بچیوں کو سکول بھیجتی مگر وہ بھی اکثر گھر پر ہی ہوتیں......کبھی کاپی نہ ہوتی تو کبھی پنسل......کبھی کپڑے نہ ہوتے تو کبھی جوتے۔

....

گیرج کے بڑے استاد نے ترش لہجے میں آواز دی۔

پپو......اوئے پپو......!

ایک نو دس سال کا بچہ جی جناب کہتا ہوا بھاگا بھاگا آیا۔

پلاس دے۔

یہ لو استاد۔

اوئے چابی بھی پکڑا۔

یہ لو استاد۔

یہ لو استاد کے پتر۔

چھوٹی چابی دے نا۔

بہت سے اوزاروں سے وہ چابی ڈھونڈنے لگا۔

کہاں مر گیا ہے......استاد قدرے غصے سے بولا۔

ڈھونڈ رہا ہوں استاد......پپو نے جواب دیا۔

کہاں ڈھونڈ رہا ہے؟ گدھے

پپو نے چابی استاد کی طرف بڑھا دی۔

دوسری گاڑی کے نیچے سے آواز آئی۔

پپو......ادھر آ۔

۔۔۔آیا جناب۔۔۔

پپواس جانب بھاگا۔۔۔۔

جادکان سے سکریواُٹھالا۔۔۔۔

پپو سنتے ہی دکان کی جانب بھاگا جو پاس کھڑے ٹرکوں سے پندرہ،بیس فٹ کے فاصلے پر تھی۔جب پپو دکان پر پہنچا تو سامنے کی چارپائی پر چت لیٹے ڈرائیور نے کیا۔

پپو!۔

جی استاد۔۔۔

جاہوٹل پر دو چائے کا بول آ۔

پپو نے سکریواُٹھا کر استاد کو تھما دیا اور بھاگتے ہوئے سڑک کے پار ہوٹل پر چائے کا کہنے چل دیا۔راستے میں اس نے ڈرائیور کو گالیاں بھی دیں جو پپو کے سوا کوئی بھی نہ سن پایا۔ہوٹل پر پپو کا دوست چھوٹا بھی کام کرتا تھا۔جب پپو ہوٹل منیجر کو دو چائے کا کہہ رہا تھا تو ہوٹل کے کونے میں چھوٹے بڑے برتنوں میں قدرے چھپا ہوا چھوٹا اُٹھا۔اس نے پپو کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔۔۔۔۔اور خود برتنوں میں چھپ گیا۔۔۔۔۔۔پپو چھوٹے کے پاس جا بیٹھا۔چھوٹا بولا۔

آج میں جلدی چھٹی کروں گا۔

پھر یہ طے ہوا کہ دونوں جلدی چھٹی کریں گے اور جا کر کھیلیں گے۔ان کے محلے کے سارے لڑکے شام کو کھیلتے۔۔۔۔۔۔۔۔کبھی کبھار۔۔۔۔۔۔۔پپو اور چھوٹا بھی ان کے ساتھ کھیل لیتے تھے۔۔۔۔۔وہ دونوں آپس میں طے کر رہے تھے کہ کس وقت چھٹی کی جائے کہ پیسے بھی مل جائیں۔چھوٹے کو صرف ایک فکر لاحق تھی کہ دیر سے چھٹی کرنے پر اُسے سالن اور روٹیاں مل جاتی تھیں جبکہ پپو کا یہ مسئلہ نہ تھا......پپو فارغ اوقات میں کسی بھی تھکے ڈرائیور کا سر دبا دیتا تو وہ اسے پانچ دس روپے دے ہی دیتا۔

جبکہ پپو کے حالات چھوٹے سے یکسر مختلف تھے۔اس کا والد زندہ تھا...... یہ الگ بات

ہے کہ وہ ہر وقت گھر میں لیٹا رہتا، پھر پپو کے سر پر گھر کا بوجھ نہ تھا کیونکہ گھر میں والدین کے علاوہ بھلا تھا بھی کون،،،،،،،، پپو کے والد کا اکثر بیوی سے جھگڑا بھی رہتا اور وہ کبھی کسی کے ہاں تو کبھی کسی کے ہاں مہمان رہتی۔ جب کبھی صلح ہوتی تو دو تین دن گھر میں سکوں رہتا پھر نجانے کیا ہوتا۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بلند ہوتیں۔ برتن بھی کتنے تھے......دو سٹیل کے گلاس، چار پلیٹیں ایک جگ......ان پر اتنے گہرے نشانات تھے کہ جیسے کسی نے پتھروں تلے رکھ کر خوب درگت بنائی ہو۔

جب پپو اٹھ کے گیرج جانے لگا تو چھوٹا بولا۔

۔۔۔۔پپو یار،،،،،،،، اگر مجھے ہوٹل سے ترکاری اور روٹیاں نہ ملیں تو؟

۔۔۔۔۔۔پپو نے کہا......تو کیا؟۔۔۔کہہ دینا ہوٹل میں بچا ہی کچھ نہ تھا۔۔۔۔۔

چھوٹا پھر کہنے لگا۔۔۔۔یار بہنیں اور امی خفا ہوں گی۔

پپو نے بے زاری سے کہا کوئی بھی خفا نہیں ہوتا۔ بس آج جا کر کھیلیں گے اب رنگ میں بھنگ نہ ڈال۔ میں بھی تو تیری وجہ سے جلدی چھٹی کر رہا ہوں۔

چھوٹا چاہتے نہ چاہتے حامی بھر گیا۔ پپو سڑک پار کر کے جونہی گیرج پہنچا تو استاد نے اس کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ رسید کر دیا۔۔۔۔ پپو کا سر چکرا گیا۔ کان بھی بند ہوتا محسوس ہونے لگا۔ کافی دیر تک اس کا کان سننے سے قاصر رہا۔

کدھر مر گئے گئے تھے؟ استاد چلایا

چائے کا بتانے گیا تھا...... پپو بولا

چائے کا۔ بتانے گئے تھے یا چائے بنانے۔۔۔استاد نے غصے میں کہا

پپو کچھ نہ بولا۔

جاؤ جا کر اوزار دھونے کیلئے پیٹرول لاؤ......استاد نے پچاس روپے تھماتے ہوئے کہا۔

پپو گیلن لیے پیٹرول پمپ کی جانب چل پڑا جو تھوڑا ہی دور واقع تھا۔ گھنٹے بعد واپسی ہوئی۔ پپو جاتے ہوئے گاڑیوں کے نمبر اور سامنے کی باڈی دیکھتا۔ جب گاڑی گزر جاتی تو پچھلی جانب بنے نقش ونگاروں پر نظر جا ٹھہرتی۔ پپو جب پیٹرول لے کر پہنچا تو استاد اور دیگر کاریگر کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔۔ پپو نے گیلن رکھا تو اُسے کھانا کھانے کا حکم دیا گیا۔۔۔ پپو نے دو چار نوالے لگائے۔ چینک سے چائے پیالی میں انڈیلی اور روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کھانے لگا۔۔۔ اتنے میں آواز آئی۔

جلدی کھانا کھا کے ادھر آ۔

پپو جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈالے جا رہا تھا۔ دن اسی طرح گزرتا گیا۔

....

ہوٹل میں چھوٹے نے سارے برتن مانجھ دیئے۔ نیچے بکھرا گند صاف کیا۔ وہ بچی کچھی چائے کی پتی کو نالی میں پھینک کر صفائی کر کے جھاڑو دینے لگا۔ جب سارا کام ختم ہو چکا تو ہوٹل کے مالک کے پاس جا کر قدرے سہمے ہوئے کہنے لگا۔

مجھے آج گھر جلدی جانا ہے...... مجھے چھٹی دے دیں

ہوٹل کا مالک جو تھوڑی ہی دیر پہلے ایک گاہک سے ریٹ پر توں تکرار کر چکا تھا غصے سے بولا۔

چھٹی اور وہ بھی پانچ بجے؟...... ہوٹل کا پتا ہے کتنے بجے بند ہوتا ہے؟؟

وہ......وہ مجھے گھر سے کہا گیا تھا کہ آج جلدی آنا۔ چھوٹا قدرے ہمت کر کے گویا ہوا۔

اچھا تو باقی برتن کون دھوئے گا؟

چھوٹا چپ چاپ سوالیہ نظروں سے ہوٹل کے مالک کو دیکھنے لگا...... تھوڑی دیر بعد نجانے مالک کے دل میں کیا آیا۔ کاؤنٹر کھولا پچاس کا نوٹ چھوٹے کو تھماتے ہوئے کہا...... صبح جلدی آنا......آج کی طرح دیر نہ کرنا۔

جب چھوٹا ہوٹل سے نکلنے لگا تو اس کے جی نے چاہا کہ ہوٹل کا مالک اسے دوپہر کی بچی ہوئی روٹیاں اور سالن بھی دے دے۔۔۔۔۔۔مگر اس کی یہ خواہش۔۔۔خواہش ہی رہی۔۔۔

وہ ہوٹل سے نکل کے سامنے گیرج کی جانب چلنے لگا۔سڑک پر کافی رش تھا۔چھوٹا انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہ گھر والوں سے سالن اور روٹی کی بابت کیا کہے گا۔وہ چلتے چلتے سڑک کے درمیان میں جا پہنچا۔ایک تیز رفتار گاڑی اوورٹیک کرتے ہوئے چھوٹے کو کچلتی ہوئی آگے نکل گئی۔گیرج کے سامنے کھڑے اور ہوٹل کے باہر بیٹھے لوگ چلا اُٹھے۔سب چھوٹے کی جانب لپکے۔چھوٹا سڑک کے درمیان خون میں لت پت پڑا تھا۔پپو لوگوں کے حصار کو چیرتا ہوا چھوٹے کے پاس جا پہنچا اسکا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے اس کے چہرے کو تھپکایا۔۔میرے دوست چھوٹے بول نا۔۔پپو کو دیکھتے ہوئے چھوٹے کے منہ سے۔ر۔ر۔رو۔رو۔روٹی کے الفاظ نکلے۔۔۔۔

خدمتِ خلق

شگفتہ نے اپنے پاس سے تمام رقم میز پر رکھ دی تھی۔ آتے وقت پڑوسن نے بچے کو جو پیسے دیئے وہ بھی میز پر رکھ دیئے......مگر اب بھی رقم میں سے کچھ پیسے کم تھے۔ اسی دوران لیڈی ڈاکٹر جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی غصے سے نسخے کی پرچی پھاڑتے ہوئے اس کی جانب اچھال دی۔ شگفتہ لیڈی ڈاکٹر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر نے سامنے لگی بیل بجائی۔ باہر کھڑی ملازمہ اندر آئی تو لیڈی ڈاکٹر نے غصے سے کہا کہ ان لوگوں کو باہر نکالو۔ پاس ہوتا کچھ نہیں اور آجاتے ہیں پرائیویٹ چیک اپ کرانے۔

ملازمہ نے شگفتہ کی جانب بڑھنا چاہا لیکن وہ اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگائے آگے بڑھ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر کی آواز باہر بیٹھے مریضوں اور ان کے ساتھ آئے تیمارداروں نے صاف سن لی تھی۔ شگفتہ بچہ اٹھائے نظریں جھکائے کلینک سے باہر نکل گئی۔ باہر بیٹھے تمام لوگوں نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا......

لیڈی ڈاکٹر نے پھر سے دوسرے مریضوں کا چیک اپ شروع کر دیا۔ شگفتہ نے باہر جا کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر سرکاری ہسپتال کی راہ لی۔ جب پیدل چلتے چلتے وہ ہسپتال پہنچی تو معلوم ہوا کہ آج ڈاکٹر موجود نہیں۔ شگفتہ نے گیٹ پہ کھڑے سنتری سے پوچھا......

بھائی جان! بچوں کے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔

آج تو کوئی بھی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہیں......سنتری نے جواب دیا

مگر کیوں؟ شگفتہ نے قدرے حیرانی سے پوچھا......

جی آج وہ اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال پر ہیں......

کوئی تو ہوگا؟ شگفتہ نے پھر پوچھا......

کوئی بھی نہیں ہے،......سنتری نے گیٹ کی دوسری جانب دیکھتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا۔

کیا اتنے بڑے ہسپتال میں کوئی ایک بھی ڈاکٹر نہیں؟ شگفتہ چلاتے ہوئے بولی۔

جی! میں نے کہا کوئی بھی نہیں ہے......اور وہ دوسری جانب چل پڑا۔

شگفتہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کرے؟ بچے کو کس کے پاس لے کر جائے اور کس سے دوائی لے؟ بچہ نڈھال تھا۔ اب تو پہلے کی طرح نہ تو وہ رو رہا تھا اور نہ ہی اُس کی وہ پہلے جیسی چیخ و پکار تھی۔ شاید وہ اپنا جسم ماں کے سپرد کر کے سکون محسوس کر رہا تھا مگر اُس کے آگ کی مانند تپتے جسم کی گرمائش اس کی ماں محسوس کر رہی تھی۔ شگفتہ بار بار بچے کا جائزہ لے رہی تھی مگر وہ کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اس نے سوچا کہ ہسپتال میں مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے کسی اور کلینک کی راہ لے......وہ کلینک ہی کی تلاش میں تھی مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ اس کے پاس جو رقم ہے وہ کم ہے۔ کہیں وہاں بھی اسے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے؟

وہ اپنے خاوند، بھائیوں اور رشتہ داروں کو بُرا بھلا کہے جا رہی تھی مگر ماسوائے اس کے وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ سو دو سو قدم ہی چلی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ بچہ حرکت نہیں کر رہا۔ اس نے نڈھال بچے کے چہرے کو تھپکایا اور اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر وہ آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ شاید اس نے آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لی تھیں......وہ اپنی ماں سے بہت دور جا چکا تھا......ضبط کی تمام حدیں ٹوٹ گئیں......شگفتہ نیم پاگل ہو چکی تھی......وہ اپنے بچے سے شکوے کرنے لگی......تم ایسا نہیں کر سکتے......میرے ساتھ تم ایسا نہیں کر سکتے......تم سے پہلے والے بچے بچیاں بھی مجھے چھوڑ گئے ہیں......تم میری گود خالی کر رہے ہو؟......نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے؟......آنکھیں کھولو! میں کہتی ہوں آنکھیں کھولو......مگر اسے رونے یا چیخنے کی کوئی آواز سنائی نہ

دی۔

وہ دیوانی سی ہو چکی تھی پھر نجانے اُس نے کیا سوچا اور بچے کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔اس کی چیخیں دور دور تک سنی جا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد لوگوں کا جم غفیر کھڑا ہو چکا تھا......وہ آپے سے باہر ہو چکی تھی۔کئی لوگوں نے معصوم بچے کو دیکھ کر افسردگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ کچھ رقم بھی دینا شروع کر دی۔شگفتہ بددعائیں دیئے جا رہی تھی۔اُس کی یہ بددعائیں ان مسیحاؤں کے لیے تھیں جنھوں نے خدمتِ خلق کی آڑ میں انسانیت کی توہین کرتے ہوئے اسے ہسپتال سے نکالا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں روپے تو جمع ہو گئے......مگر......آج اُس کی جھولی اولاد سے خالی ہو گئی تھی۔

خون

وہ سامنے بچھے پلنگ پہ دھڑام سے گرا تو پلنگ کے سارے پیچ ہل گئے۔موبائل اُس کے ہاتھ سے گر چکا تھا...... وہ زمین سے موبائل اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کا جسم اس کے ارادے کا ساتھ نہیں دے رہا تھا شاید اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ اپنی جگہ سے کھسک گیا ہو وہ پیچھے مڑنا چاہتا تھا مگر مڑ نہ سکتا تھا جسم کو حرکت دینے سے پلنگ کے چاروں پیچ آوازیں نکال رہے تھے......

یہ کیا ہوا......کیوں ہوا......کیسے ہوا......کب ہوا......؟

پورے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی کمرے کی چھت سے لٹکا پنکھا بھی کھچ کھچ کر رہا تھا اسے گریس کی کمی کی شکایت تھی دوسری آواز پلنگ کے پیچوں کی تھی۔

یہ کھچ کھچ اور چوں چوں پھر سامنے لگی تصویر پہ نظر جا پڑی کتنی خوبصورت تصویر تھی باغات تھے، کھیت تھے، پہاڑ تھے درمیان سے ایک کشادہ راستہ منزل پہ پہنچ جانے کی غمازی کر رہا تھا۔

پھر یہ کیسا پہاڑ ٹوٹا اور کیوں ٹوٹا......؟

وہ خود سے مسلسل سوالات کیے جا رہا تھا اب اسے پلنگ بھی بے آرام کر رہا تھا وہ سیدھا لیٹ جانے میں بھی ناکام رہا اسے یہ خوف بھی تھا کہ پلنگ کے پیچ ٹوٹ ہی نہ جائیں۔اسکے چاروں طرف سے پیچوں کے ڈھیلا ہونے سے چوں چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔وہ اس کوشش میں تھا کہ وہ کمرے سے نکل کر بازار جائے مضبوط پیچ لا کر پلنگ کو ٹھیک کرے مگر پنکھے کی شکایت بھی

تو تھی...... کمرے سے باہر نکلنے کا احساس اس پر خوف بن کر طاری ہو چکا تھا وہ اتنی سیڑھیاں کیسے اترے گا پھر سیڑھیوں کے بعد سخت دھوپ میں کہاں کھڑا ہو گا سڑک کی دونوں جانب ٹھنڈی چھاؤں اور گھنیرے پتوں والے درخت تو بلدیہ والوں نے کاٹ دیئے رہی سہی کسر عام لوگوں نے نکال دی تھی۔

سڑک پر اضطراب اور عدم تحفظ کی فضا بدستور قائم تھی ایک تیز گاڑی گرد و غبار اڑاتی ہوئی گزری...... فضا میں گولیوں کی آواز سنائی دی...... سائرن بھی بج رہا تھا شاید پولیس گشت کر رہی تھی...... کمرے کی دوسری جانب دیوار پہ لال بیگ اور چیونٹیاں قطار در قطار سفر کر رہی تھیں...... اب حالت یہ تھی کہ کمرے میں انہی کا راج تھا وہ سوچ رہا تھا کہ مجھے اٹھ کر ان کے تلف کرنے کی دوا لانی چاہیے ورنہ اس کمرے پہ صرف ان ہی کی حکمرانی ہو جائے گی کیڑے مکوڑے اس کی طرف بھی منہ بنائے جا رہے تھے۔

شاید لوگ بھی ایک دوسرے سے بیزار، نا آشنا، اپنے اپنے خول میں بند تھے...... کسی کو کسی کی بھی پرواہ نہ تھی اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی...... اب کیڑے مکوڑے کمرے میں اپنی تعداد بڑھا رہے تھے اور اس کا وجود صرف ایک بے جان شے کی مانند سا تھا۔ کرفیو کا نفاذ ہونے کو تھا مگر کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اب بھی اس کے پاس دو مثبت جواز تھے ایک اسے پلنگ کے چاروں پیچ لانے تھے اور دوسرا کیڑے مکوڑوں کو تلف کرنے کی دوا خریدنی تھی...... وہ اپنے دوست کے بارے میں سوچنے لگا جو کہانیاں لکھتا اور بڑے سلیقے سے ان کی بنت کرتا تھا مدتوں سے ملاقات نہ ہوئی شاید اس نے کہانیاں لکھنی چھوڑ دی تھیں...... یہ کہانیاں لکھنے والے لوگ بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں اپنے ہی ذہن سے نجانے کہاں کہاں کی خبر لے آتے ہیں اور اپنے ہی خیالات کی وادی میں گم رہتے ہیں جب کوئی کہانی لکھ لیتے ہیں تو خود کو فنکار سمجھتے ہیں اور اپنے لیے تخلیق کار کا نام زیادہ پسند کرتے ہیں۔

پلنگ کی چوں چوں بدستور قائم اور پنکھے کی کھچ کھچ بھی منہ چڑھائے جا رہی تھی اُس کا کہانیاں

لکھنے والا دوست لفظوں کی الٹ پلٹ اور منظر کشی سے اوراق سیاہ کیے جا رہا تھا۔ واہ......وہ بھی کیا شخص تھا......اسکی کہانیاں پڑھ کر وہ کچھ دیر کے لیے خود سے دور اسکی کہانیوں میں محو ہو جاتا تھا تنہائی بھی کس قدر اذیت ناک شے ہے......شاید وہ پاگل تھا......اور اگر نہیں تھا تو ایک دن وہ ضرور پاگل ہو جائے گا......

پھر اسے اپنی کہانیاں سنانے کے لیے اِس پاگل خانے میں آنا پڑے گا۔

اُس نے کوشش کی کہ اٹھ جائے مگر اُس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا...... جب وہ اٹھنے میں کامیاب ہوا تو سامنے لگے آئینے پر نظر جا ٹھہری......اُف چہرے پہ کس قدر بال......کیا حال بن گیا ہے......پھر خود سے بولا......چھوڑو آئینے میں کیا رکھا ہے......مگر کیا میں وہی ہوں......جو آئینے میں نظر آ رہا ہوں......

معلوم نہیں......شاید وہی......یا شاید کوئی اور......

کمرے کے چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ اور لال بیگ اور چیونٹیاں انہیں چاٹنے کے لیے کمر بستہ بھی تو تھے۔

وہ کمر کو قدرے سیدھا کر کے، دیواروں کو ہاتھوں سے تھامے، نپے تلے قدم اٹھاتے خراماں خراماں سیڑھیوں کی جانب چلنے لگا اُس کا جی چاہا کہ وہ نیچے نہ جائے مگر اپنے تئیں ڈھارس باندھی اور چل پڑا۔ سامنے سیڑھیوں میں تاریکی تھی۔ کھلی فضا میں خوف تھا......دروازے ٹوٹ رہے تھے......دیواریں گر رہی تھیں......لوگ پریشان تھے......سیاست دان بھٹی میں آگ کو تیز کرنے کے لیے ایندھن جمع کر رہے تھے......

آج آسمان بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدل چکا تھا آسمان کی جانب اٹھتے آگ کے شعلوں سے خون کی بو آ رہی تھی۔ کئی مخلص خون میں نہا چکے تھے۔ کئی کا خون بہہ رہا تھا۔ لوگ لوگوں کا خون پینے کے لیے گشت کر رہے تھے۔ خون ابل رہا تھا، کھول رہا تھا......ماؤں کے بیٹے چھن چکے تھے، بچے یتیم ہو چکے تھے، بیویاں بیوہ اور بہنوں کے بھائی بچھڑ چکے تھے کئی بچے خوف سے سہم چکے تھے......

شاید انسانیت تباہی و بربادی پھیلانے کے لیے ایک نیا بم بنانے میں مگن تھی، سمندر کی موجوں میں طوفان تھا...... بے یقینی اور بے سروسامانی کی حالت میں نہتے لوگ سفرِ آخرت کے لیے کمر بستہ تھے......وہ خوش تھے جنہوں نے ان کی خون آلود قبروں پہ اپنے محل تعمیر کروانے تھے......

اسکالر، پروفیسر، دانشور، قلم کار، شاعر حواس باختہ تھے ان کی آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی ان کے قلم رک چکے تھے اور زبانیں گنگ ہو چکی تھیں......وہ تذبذب کا شکار تھے......

خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی......آزادی کا ایک اور نیا سبق پڑھایا جا رہا تھا زبانوں پر اک نئی زمین کا نام لیا جا رہا تھا قدم زمین پر ہونے کے باوجود بے سہارا محسوس ہو رہے تھے سروں پہ آسمان کی رنگت پہلے والی نہ تھی......وہ بھی بدلی بدلی تھی۔ پیدائش کے وقت کی پہچان ختم ہو چکی تھی ہر طرف سے نفرت میں لتھڑی تعفن زدہ آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں......جلاؤ......گرادو......ختم کردو......بے ربط آوازیں ہر جانب سے آ رہی تھیں۔

جس طرح لال بیگ اور چیونٹیاں کتابوں کو چاٹنے کے لیے قطار در قطار سفر کر رہی تھیں اسی طرح سارے لوگ ایک نئے وطن کے قیام، نئی زبان کے احیاء اور نئی آزادی کا سفر طے کر رہے تھے۔ جس میں حسبِ روایت غریبوں، مسکینوں، ناداروں، سچے کھرے اور صاف ستھرے لوگوں کے خون سے بنیاد ڈالی گئی تھی۔

زیست کا قرض

وہ دیر تک مسہری پہ کروٹیں بدلتا رہا بظاہر خاموش و متین مگر ٹوٹ پھوٹ کا شکار۔ ایک آتش فشاں اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ اُس نے سامنے کی کھڑکی کھولی ...... گہری سیاہی نے نیلے آسمان کو اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ ٹمٹماتے تاروں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے اُس کے سینے کو چھوا تو بدن میں تھرتھری سی پھیل گئی۔ وہ خود کو ٹٹولنے لگا...... گہری خاموشی اور ویرانی اُس کے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ اُس کا دِل تو اشک بار تھا ہی اب اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے اُس کے چہرے کو سُن کر دیا تھا۔ وہ خود کو نہ صرف اِس گھر میں بلکہ ساری کائنات میں تنہا محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود سے ہم کلام ہوا ''انسان کا اصل مقام کون سا ہے'' اور پھر خود ہی جواب دیا ''وہ جو اُس کی ملکیت میں ہوتا ہے'' ......مگر انسان کی ملکیت کیا ہے......؟ شاید کچھ بھی نہیں۔

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا چاند کو دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن کہیں اور تھا......زندگی کتنی جلدی گزر گئی ہے۔ اُسے اپنا بچپن، بچپن کے دوست اور بچپن کی شرارتیں یاد آنے لگیں۔ اُس کی سرخ آنکھیں چاند پہ ٹکی تھیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں اور وسعتوں میں جگ مگ کرتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ پھر گویا ہوا ''نجانے کتنی ہی دنیائیں آباد ہیں؟'' ......

اُس کے احساسات کی دنیا جاگ اٹھی۔ اُسے اپنے سارے یار بیلی نظروں کے سامنے گھومتے نظر آنے لگے۔ جن میں سے کئی آخرت کے سفر پہ جا چکے تھے۔

اُسے اپنے والدین کی یاد آنے لگی۔ کتنی محبت کرتے تھے۔ منہ سے جو نکالو پورا کرتے اور ہر وقت دعائیں......اُسے اپنے والد کی آغوش اور والدہ کا پیار اور وہ لمحات شدت سے تڑپانے

لگے۔ اُسے یاد آیا کہ جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو اس کے ماں باپ کس قدر خوش تھے۔ والد نے دل سے لگا کر دعائیں دیں اور والدہ نے ماتھا اور گال چوم لیے تھے۔ بہنوں اور بھائیوں نے خوب خوشیاں منائی تھیں۔ گھر میں ایک فرد کے اضافے سے زندگی کے طور طریقے ہی بدل ڈالے تھے۔ وہ اپنی زمینوں میں اب پہلے سے زیادہ کام کرتا تھا۔ بیوی بھی تو ہاتھ بٹھاتی تھی۔ پیوند کاری کے موسم میں پھلدار درختوں کو قطار در قطار لگایا گیا تھا۔ نہر کے پانی کو زمین کے درمیان سے گزار کر دونوں اطراف سبزیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ اُسے عجیب سی مسحور کن لہر اپنے وجود میں اٹھتی محسوس ہوئی جس نے اُس کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔

وہ اپنی جوانی کے دور میں جا پہنچا۔ بیوی کی خواہشات کی تکمیل بھی اور والدین اور بہن بھائیوں کی فرمائشیں بھی پوری ہوتی تھیں...... ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں...... اُن درختوں نے خوب پھل دیا جو اُس نے اپنے ہاتھوں سے زمین میں دبائے مگر قسمت نے ایک نعمت دے کر دوسری نعمت سے محروم بھی رکھا۔ وہ سوچنے لگا جو درخت میں نے لگائے آج وہ اچھی خاصی عمر گزار چکے ہیں۔ اُسے اپنی پہلی اور آخری اولاد...... اپنی بیٹی یاد آئی جس نے آنکھ کھول کر اُس کا اور اپنی والدہ کا خوب دیدار کیا مگر ایک دن اور ایک رات گزارنے کے بعد منہ موڑ گئی۔ کیا کیا خواب بنے تھے؟؟ زمین کے وسیع قطعے پہ مکان تعمیر کیا تھا کہ آنے والی نسل کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ کتنے ہی ارمان تھے جو ادھورے رہ گئے۔

بچپن ہی سے کھیتوں، کھیتوں میں بہتی ندیوں، ندیوں میں نہاتے درخت، درختوں کے ساتھ اُبھری سبزے کی مہک اُسے بے حد پسند تھی۔ زمین کے درمیان سے گزرتی ندی کی مدھر آواز میں کھو جایا کرتا تھا۔ اُسے اپنی شریکِ حیات بھی یاد آنے لگی۔ کتنی ہمت والی صابر خاتون تھی۔ کبھی کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ جیسے حالات بھی ہوتے خندہ پیشانی سے برداشت کرتی۔ اس نے کھڑکی سے ندی پر نظر ڈالی...... رات کو پانی پہ رقصاں چاند کا عکس اور پانی سے منعکس ہوتی چاند کی روشنی دل کو سکون دینے لگی تھی۔

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اُسے اپنا وجود شل ہوتا محسوس ہونے لگا تو وہ کھڑکی بند کر کے مسہری پہ آن بیٹھا......دن کے وقت کہے گئے بھائی کے الفاظ اُسے بار بار یاد آتے اور بے چینی اور اضطراب میں اضافہ کرتے جاتے...... وہ تھرتھرائے جا رہا تھا۔ چہرے پہ اُداسی عیاں تھی۔ وہ خود سے ہم کلام ہوا......کاش! والدین زندہ ہوتے...... پھر سوچنے لگا اگر زندہ ہوتے تو آج پورے ایک سو پندرہ سال کے ہوتے...... پھر خود کلامی کرنے لگا......کاش بیوی زِیست کے اِس سفر میں میرا ساتھ چھوڑ کے نہ جاتی......اگر زندہ ہوتی تو پورے اسی سال کی ہوتی...... پھر سوچنے لگا بیٹی زندہ رہتی تو آج وہ بھی بڑھاپے میں قدم رکھ چکی ہوتی۔

وہ انہی یادوں کو سینے سے لگائے مسہری پہ لیٹ گیا۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آج اُس کے بھائی نے اُسے نیا کمرہ جو دے دیا تھا۔ اِس کمرے میں آج پہلی رات تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا وہ حویلی میں رہتا رہا تھا۔ وہاں ہی پلا بڑھا، جوان ہوا، شادی ہوئی، بیوی کے ساتھ بھی وہیں رہا اور اُس کے چلے جانے کے بعد بھی ساری زندگی اب تک وہیں ہی گزاری۔ اُسے ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا اُس کی زندگی کی ساری یادیں حویلی کے ساتھ جڑی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا...... وہ پکار رہا تھا...... ابو! کہاں ہو...... امی! کہاں ہو...... چھوٹی مالکن! کہاں ہو...... وہ مسلسل پکار رہا تھا مگر وہاں صرف تنہائی تھی......

کمرے میں اُسے وحشت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہر جانب مکمل خاموشی اور گہرا سکوت تھا......حویلی کی عقبی جانب واقع کمرے میں اُس کا جی گھبرانے لگا۔ وہ کھیتوں کی جانب چل دیا۔ اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا......وہ کتنا بے بس اور لاچار ہے......اُسے اپنی جوانی یاد آ گئی جب زمین میں درخت لگانے کے لیے مزدور کھدائی کر رہے تھے تو جب بھی کوئی بڑا پتھر آتا تو وہ مزدوروں سے کدال لے کر توڑ دیتا۔

دن کا واقعہ ایک بار پھر اُسے ماضی سے حال میں کھینچ لایا۔ کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں؟......نہیں نہیں......ایسے نہیں ہوتے......وہ خود کلامی کر رہا تھا...... مجھے طعنہ کیوں دیا گیا؟......

وہ مسلسل خود سے سوال کر رہا تھا......ایسا طعنہ جو میرے بس میں ہی نہیں......میں نے زندگی عزت دار اور خاندانی لوگوں کی طرح گزاری ہے...... مجھے یہ طعنہ دینا کہاں کا انصاف ہے؟...... یہ تو سراسر زیادتی بلکہ ظلم ہے......اللہ نے مجھے ایک بیٹی دے کر دوسرے دن واپس لے لی۔ میں نے صبر وشکر کیا......آج جب میں کسی کام کے قابل نہیں رہا تو مجھ سے میرا گھر واپس لے لیا گیا۔ وہ کمرہ مجھ سے چھین لیا گیا جس کمرے میں میری زندگی کا پل پل گزرا۔ جہاں یادیں در و دیوار کے ساتھ منسلک ہیں......وہ خود سے بار بار کہے جا رہا تھا......میرے ساتھ ظلم ہوا......زیادتی ہوئی...... مگر کیوں ہوئی؟......صرف اِس وجہ سے کہ میں بے اولاد ہوں......یا اللہ!...... یہ کیسا انصاف ہے؟؟

سورج کی کرنیں پھیل رہی تھیں۔ چڑیوں کی آوازیں اور کوؤں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ ندی مسلسل شور مچائے جا رہی تھی۔ درختوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی......حویلی کے باسی ناشتے میں مصروف تھے جبکہ حویلی کی پچھلی جانب کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ملازم ناشتہ اندر رکھ کر بڑے مالک کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر بڑا مالک کہیں نظر نہ آیا۔ ملازم تھوڑی تلاش کے بعد حویلی واپس لوٹ گیا اور چھوٹے مالک سے کہا ''بڑے مالک اپنے کمرے میں نہیں ہیں......''

چھوٹے مالک نے قدرے سوچتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا اور حویلی کے عقبی کمرے کی جانب چل دیا۔ بڑے مالک کی عدم موجودگی اور کمرے کی وحشت نے مل کر ایک عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچنے کے بعد تیزی سے کمرے میں سے نکلا اور کھیتوں کی جانب چل دیا۔ اس نے ابھی چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اسے بڑا مالک ندی کے کنارے پڑا نظر آیا۔ وہ شور مچاتا ہوا اُدھر لپکا۔ جب بڑے بھائی کے پاس پہنچا تو بڑا بھائی زِیست کا قرض اُتار کر اُس سے بہت دور پہنچ چکا تھا۔

وقت نے کروٹ بدلی اور دس سال بیت گئے......دس سال بعد اسی کہانی نے پھر ایک المیے کو جنم دیا۔ اسی ندی کے کنارے کم و بیش ایسے ہی حالات سے گزرنے کے بعد ماضی نے اپنے

آپ کو دہرایا...... اِس بار اولاد کے ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا ہی واقعہ وقوع پذیر ہوا تھا...... جس کا شکار چھوٹا مالک تھا۔

سبکدوش

بجلی جاتے ہی کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔جعفر نے دو چار صلواتیں بھیجنے کے بعد خیالات کا سلسلہ جوڑنے کی ناکام کوشش کی۔ پہلے تو زیرو بلب اپنی مدہم مدہم روشنی کمرے میں بکھیر رہا تھا پھر اچانک ہی بجلی آ گئی آج نجانے کیوں بجلی جانے کا دورانیہ عام دنوں کی نسبت کم تھا اپنے پلنگ کی ایک جانب کروٹ لے کر جعفر دوبارہ گہری سوچوں میں جانے کو ہی تھا کہ اسے پیاس نے ستایا......سامنے تپائی پہ رکھے جگ کو اٹھایا تو وہ خالی تھا وہ آہستہ آہستہ باہر نکلا جگ کو پانی سے بھر کے کمرے میں گلاس ڈھونڈنے لگ گیا۔ پلنگ کے نیچے سے گلاس ملا۔ پانی پی کر چت لیٹ گیا پھر طبیعت نے سگریٹ کی طرف مائل کیا جیب ٹٹولنے لگا مگر سگریٹ تو وہ جیب سے نکال کر ساتھ والی الماری میں رکھ چکا تھا۔الماری کھول کے سگریٹ سلگائی ایک مرغولہ ہوا میں گردش کرنے لگا وہ مرغولے کو غور سے دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ چاروں جانب پھیلے جا رہا تھا۔

وہ مرغولے میں کچھ تلاش کر رہا تھا اس کا چہرہ بظاہر پرسکون تھا مگر اس کے اندر طوفان برپا تھا۔ چپ چاپ کسی شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح خاموش...... باہر تو ہلکی ہلکی بارش تھی مگر اندر کہرام مچا تھا......اُس کے سگریٹ سے نکلنے والے مرغولے پورے کمرے میں پھیلتے اور مرغولے بنانے والے سگریٹ کو اُس کے انجام تک پہنچا رہے تھے......

سامنے دیوار پہ لگی گھڑی کی سوئی وقت کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھے جا رہی تھی۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور دھوئیں کو اپنے اندر اتار دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ناک اور منہ کے رستے دھواں باہر آنے لگا اسے اپنی زندگی کے گزرے وہ لمحات شدت سے یاد آ رہے تھے جب اس کے

دوست اُسے نصیحت کیا کرتے تھے۔

ایک دن عرفان گویا ہوا تھا ''یار جعفر! تو ہر شے کا حساب رکھا کر۔ جہاں جہاں جو کچھ لگا تا ہے اُسے لکھ لیا کرتا کہ کل کوئی تجھ سے حساب مانگے تو تجھے کوئی تر ددنہ ہو......''۔

جعفر نے عرفان کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا ''کون حساب مانگے گا یار...... سچ بتاؤں تو میں نے کبھی اخراجات کا حساب رکھا ہی نہیں ہے۔ بس رب دے رہا ہے......''

یہی بات تو غلط ہے۔ تو میری بات کو سمجھ نہیں رہا۔ عرفان نے قدرے زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے ساری عمر محنت کی، نہ دن کو دن سمجھا اور نہ ہی رات کو رات جانا۔ جو کمایا اپنے گھر والوں پہ خرچ کیا...... مستقبل کے لیے کیا یہ کم ہے کہ زمین خرید لی...... تُو تو جانتا ہے کہ زمین کتنی مہنگی ہو گئی ہے...... جعفر نے فاتحانہ انداز میں عرفان سے کہا......

عرفان اُسے بغور دیکھنے لگا۔ پھر جعفر کو وہ دن یاد آیا جب وہ ایک تنازعے کے حل کے لیے دوستوں کے ہمراہ گیا تھا...... نسیم اور اختر دونوں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا...... بات سے بات نکلی۔ نسیم نے اپنی محنتوں اور کوششوں کی تفصیلات مہیا کیں اور اختر نے اپنے کام گنوائے۔ مسئلہ ایک مکان کے برآمدے پہ اٹکا ہوا تھا۔ کتنی محبت تھی دونوں بھائیوں ۔ میں پھر چند گز زمین پر اتنا تنازعہ اٹھا کہ اللہ کی پناہ...... علاقے کے معروف افراد تنازعے کے حل کے لیے بیٹھتے۔ جب نسیم نے چھوٹی چھوٹی باتیں گننا شروع کر دیں تو جرگے میں سے ہی ملک خورشید نے نسیم کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا ''شرم کرو...... شرم...... تم اِس قدر گر جاؤ گے ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

چھوٹے بھائی کے ساتھ برتاؤ بھی گن رہے ہو...... نسیم کچھ بولنا ہی چاہ رہا تھا کہ ملک خورشید نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا تم بڑے ہو اور بڑوں کا دِل بڑا ہونا چاہیے......

نسیم سوالیہ نظروں سے سب کو دیکھتا رہا مگر کچھ بھی نہ بولا اور جرگے کے فیصلے کے مطابق نقصان نسیم کو ہی اٹھانا پڑا۔

اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب وہ زمین خرید رہا تھا تو اُسے اپنے خاندان کے افراد نے کہا کہ تم نے ساری عمر بے حد محنت کی اور تکالیف بھی بہت اٹھائیں لہٰذا زمین کا ایک حصہ تم اپنے نام پر الگ سے لکھوا لو......جعفر کو یاد آیا اُس نے نہ صرف انکار کیا تھا بلکہ اپنے بھائیوں کی خوشی کو اپنی خوشی قرار دیتے ہوئے کہا تھا ''بھائی خوش تو میں بھی خوش''......اُسے ابرار علی کے وہ جملے بھی یاد آئے جب ابرار علی بھی بھائیوں کے ساتھ تقسیم کر چکنے کے بعد ہوٹل کے ایک کونے میں افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے گفتگو ہوئی تو غمگین لہجے میں بولا ''جعفر! میری طرح تم بھی ضرور آنسو بہاؤ گے اور کوئی تمہیں دلاسہ دینے والا نہ ہوگا''۔

جعفر کو وہ وقت بھی یاد آیا جب وہ مڈل پاس کرنے کے بعد اگلی جماعت میں داخلے کا سوچ رہا تھا۔ جب اُس کے والد نے اسے قرض اور کاروباری نقصانات کی تفصیلات بتائیں...... وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ نقصان کی رقم سب کچھ فروخت کر کے بھی تین گناہ زیادہ تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے نویں جماعت میں داخلہ لے لیا مگر اسکول سے واپسی کے بعد وہ ایک سبزی کی دکان پر کام کرنے لگا۔ جہاں سے اُسے رات گئے چھٹی ملتی اور تیس روپے ملتے۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ وہ میٹرک میں بآسانی پہلے درجے میں پاس ہو جاتا مگر گھریلو مسائل اور ذہنی الجھنوں کی وجہ سے وہ دوسرے درجے میں کامیاب ہوا۔ پھر شاید ہی کوئی محکمہ ہو جہاں اُس نے اپنے کاغذات نہ بھیجے......مگر مملکتِ خداداد میں بغیر تعلقات کے نوکری کہاں ملتی ہے؟

آخر تھک ہار کے اُس نے محلے کے ایک پلمبر کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ یہ کام وہ صرف دو ماہ میں اچھی طرح سیکھ چکا تھا مگر اب بھی وہ دیہاڑی پر ہی کام کرتا رہا۔ کئی ہزار روپے اُس نے ساٹھ روپے دیہاڑی کے عوض محلے دار پلمبر کو کما کر دیئے......ایک مخلص دوست نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ خود کام کرے اور اپنے تئیں ٹھیکے لیا کرے...... دوست کے مشورے پر عمل سے وہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی دیہاڑی لگانے لگا......اور دو سو روپیوں سے اوپر کی رقم والدہ کے ہاتھ میں دیتا۔ کئی دن ایسے بھی آئے کہ وہ کھانا کھانے کے لیے روٹی کا لقمہ ہاتھوں سے نہ توڑ پاتا۔ کام

کی زیادتی اور سیمنٹ بجری میں ہاتھوں کے استعمال سے انگلیوں سے خون رستا رہتا۔مگر اُس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائے گا اور والد کے قرض کی پائی پائی لوٹائے گا۔ پھر پانچ سال میں ہی اُس نے سارے قرض چکا دیئے۔ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم جاری رکھنے اور اچھے اسکولوں میں داخل کروانے کے لیے اُس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ اس کی محنت، اخلاص کے سب ہی قائل تھے۔

اس علاقے میں سوئی گیس کی فراہمی شروع ہوئی تو وہ بھی لوگوں کے گھروں میں پائپ فٹنگ کرنے لگا۔ روزانہ کے ہزار دو ہزار وہ آسانی سے کما لیتا تھا۔ چھوٹے بھائی کو بیرونَ ملک روانہ کرتے وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر خوشی بھی تھی کہ چلو اس کا مستقبل تو بن ہی جائے گا۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ بہنوں کی شادیاں بھی ہو گئیں اور بھائی بھی اپنے اپنے کام پر لگ گئے......

بیرونِ ملک سے چھوٹے بھائی کی واپسی تھی گھر میں خوشی کا سا سماں تھا۔والدین کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ بہنوں کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں جب جعفر اپنے بھائی کو ائیر پورٹ سے لے کر گھر پہنچا۔ دو چار روز تک لوگوں کا گھر میں خوب آنا جانا جاری رہا۔ بیرون ملک سے واپس آئے بھائی اشفاق احمد نے ایک دن جعفر سے کہا کہ ”میں آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں......

جب دونوں اکیلے میں بیٹھے تو اشفاق احمد نے ایک کاغذ پر بیس لاکھ کی رقم لکھ کر بھائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم آپ نے مجھے دینی ہے۔ کب دے رہے ہو؟ میں بعد میں لے لیتا مگر مجھے سخت ضرورت ہے۔ جعفر نے لکھی رقم پر نظریں گاڑھ لیں کیونکہ چھوٹے کی عدم موجودگی میں جو تعمیرات۔ زمین کی خریداری اور گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوشی ہوئی وہ رقم چالیس لاکھ سے بھی اوپر کی تھی جبکہ چھوٹے نے تو صرف بیس لاکھ کما کر بھیجے تھے...... دوسرے دن جعفر اپنے سارے حصے سے سبکدوش ہو گیا تھا...... سگریٹ کے مرغولے بھی ختم ہو گئے کیونکہ سگریٹ مرغولے بناتے بناتے خود ختم ہو چکا تھا......

گھروندا

انسان کبھی کبھی دوڑ دھوپ، مصروفیت، ہنگاموں سے الگ ہو کر سکون اور خاموشی بھی چاہتا ہے۔ کبھی ٹہلنے کے لیے وسیع و عریض کھیتوں کا رخ کرتا ہے تو کبھی ریگستانوں میں ریت کھنگالنے لگتا ہے اور بعض اوقات سمندر کے ساحل پر چہل قدمی...... کئی ایسے بھی ہیں جو باغات میں سبزے کو پاؤں تلے روند کر سکون حاصل کرتے ہیں۔ فطرت نے انسان کی قلبی تسکین کے لیے سامان کر رکھا ہے۔ شہر کے گرد و غبار، شور شرابے، دھوئیں اور تعفن کے مقابلے میں بلند و بالا، سرسبز و شاداب پہاڑ، لمبے چوڑے کھیت، ساحل اور ویرانے بھی اسی زمین پر موجود ہیں۔

انسانی زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ مشقت سے بھری ہوئی اور وجود کو تھکا دینے والی...... کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کو گزارنا بھی کس قدر محال ہے۔ ربّ کریم نے تو انسان کے لیے آسانیاں پیدا کیں مگر یہ خود کو مشکلات میں پھنسائے جا رہا ہے۔ کبھی وقار کی خاطر، کبھی انا اور تکبر کے زعم میں مبتلا دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے خود کو مشقت اور تکلیف میں دھنسا رہا ہے۔ دنیا کے پیمانے الگ الگ ہیں۔ کھانے بھی مختلف اور شناخت کے لیے کام اور نام کے بھی...... اس دنیا میں دو بستیاں ہیں...... ایک زندوں کی...... اور ایک مُردوں کی۔

میں مُردوں کی بستی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ جہاں خاموشی ہے، سکوت ہے۔ جہاں سبزہ اپنی مرضی سے بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ جہاں لمبے لمبے، اونچے اونچے، موٹے موٹے، نئے پرانے درخت ہیں۔ جن کی ٹہنیاں اور پتے بھی ہیں مگر افسردگی ہے، خاموشی ہے۔ پُراسرار مگر مستقل سکون محسوس ہوتا ہے۔ دنیا میں امید کے ساتھ ناامیدی، محبت کے ساتھ نفرت، امیری کے ساتھ غریبی، عزت کے ساتھ ذلت، اعتقاد کے ساتھ بے اعتقادی، سچ کے ساتھ جھوٹ، حق کے

ساتھ باطل، اور ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہے۔

جہاں میں بیٹھا ہوں یہ دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا میں اوپر بھی مٹی، نیچے بھی مٹی، اطراف میں بھی مٹی اور مٹی میں بھی مٹی پڑی ہوئی ہے۔ وہی مٹی جس سے جاندار بنائے گئے۔ جس سے نباتات نکالے گئے۔ جس سے حیوانات تشکیل دیئے گئے۔ چرند، پرند، درند اسی سے پیدا ہوئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور ایک لفظ سے ہوا۔ شاید لفظ ادا کرنے اور ان کے ہو جانے میں کوئی ہو جانا ہی نہ تھا۔

میں اپنے افکار میں الجھا ہوا تھا جب ایک طرف سے جمِ غفیر میری جانب آ رہا تھا۔ اتنا بڑا مجمع...... ہر قوم اور ہر نسل کے افراد...... شاید عظمت اور اقتدار کے رہنما کو مٹی میں ملانے آئے تھے۔ ان کی آپس کی باتیں بھی اسی عظمت کو دہرائے جا رہی تھیں۔ ان کی سرگوشیوں سے بھی اقتدار کے ایوانوں کی بو آ رہی تھی مگر یہ عظمت اور اقتدار تو محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ جس سے گوشت پوست ختم ہو چکا تھا اور خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ ڈھانچہ محض ڈھانچہ اور اس ڈھانچے کی اتنی تکریم؟ اتنی عزت کہ اسے آج مٹی میں مٹی کرنے سب ہی آن پہنچے۔ شاید یہ رفعتوں کی قدر اور عزتوں کا مینار تھا...... ہر قسم کی سواری موجود تھی۔ مہنگی سے مہنگی اور سستی سے سستی سواریاں حدِ نظر تک دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک لامتناہی عوامی سیلاب تھا۔ پھر اس ڈھانچے کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی۔ ایک فکرِ انسانیت سے مغموم چہرہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس چہرے نے دوسرے چہروں پر نظر ڈالی۔ اپنی پوشاک درست کر کے پیزار ایک طرف رکھ دیئے۔

پھر دعائے مغفرت ہوئی۔ غم سے نڈھال چہرے اس ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرف لپکے۔ شاید اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ ڈالنا چاہ رہے تھے۔ پھر کئی لوگوں نے غم بھرے الفاظ اپنی زبانوں سے ادا کرتے ہوئے آگے کی راہ لی۔ ڈھانچہ اٹھا لیا گیا۔

لوبان اور عطریات کا چھڑکاؤ ہوا۔ خطیب نے اپنے فصیح و بلیغ الفاظ سے سلامی پیش کی...... سوز تھا، درد تھا، غم تھا مگر بناوٹ کے ساتھ...... سجاوٹ کے ساتھ...... پھر جلد ہی سب اکتا

گئے۔طوالت سے بیزار مجمع واپسی کی راہ دیکھنے لگا۔کئی تو پہلے پہل ہی مڑ گئے پھرایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے بھی واپس ہونے لگے،۔پھر کیا تھا؟مٹی تھی،مٹی کی اقسام تھیں اورمٹی کا مٹی سے ملنا تھا۔گیلی مٹی،سوکھی مٹی،نرم مٹی،گوندھی مٹی،پتھریلی مٹی......لوگ واپس ہو گئے مگر میں بیٹھا دیکھتا رہا سوچتا رہا......سورج ڈھل گیا ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا۔چٹانوں،درختوں،عمارتوں اور پگڈنڈیوں پر سے روشنی ختم ہو چکی تھی۔

اسی رات چند لوگوں کا اداس مجمع اسی جگہ آیا......دو بچیاں بھی ان میں شامل تھیں۔جن کے چہرے،چال ڈھال،میلے کچیلے کپڑے،آنکھوں سے بہتے آنسو،آہیں،اور ٹیسیں بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور میرے نہ چاہنے کے باوجود میری توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں......شاید یہ کسی مفلس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔جہاں لوبان اور عطر کا چھڑکاؤ نہ تھا۔بناوٹ نہ تھی اور سجاوٹ نہ تھی۔ایک ماں کی دو معصوم بچیوں کے آنسو تھے۔ان کے سوالات تھے مگر سوالات کے جوابات نہ تھے۔یہ مٹی بھی مٹی میں ملانے کے لیے لائی گئی تھی۔

پراسرار خاموشی تھی۔آخری آرام گاہ کا خاموش سفر،درخت خاموش،رات خاموش،محض چند لوگ مگر خاموش،فضا خاموش،ہوا خاموش،واپسی بھی خاموشی کے ساتھ،اتنی خاموشی کہ فضا دنگ رہ گئی......سب لوک جس خاموشی سے آئے تھے اسی خاموشی سے درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گئے......صرف ان دو معصوم بچیوں کی آہیں تھیں جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد خاموشی کے حصار کو توڑتی تھیں۔

میں نے شہر کی طرف دیکھا جہاں آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنیاں مختلف رنگوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔یہ دولت اور قوت والوں کے مسکن تھے۔میں نے مٹی میں پڑی مٹی کے بارے میں مزید غور کیا۔پھر اپنی کمزوریوں،لغزشوں کو ڈھونڈنے اور اُن کے کھوج کے لیے اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کی......خود کو ٹٹولا،جھنجھوڑا......شاید میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔پھر مجھے سمجھ آیا کہ میں جس مٹی پہ بیٹھا ہوں یہ مٹی بھی اقتدار والوں کے لیے الگ ہے اور ان

کے غلاموں کے لیے الگ...... بظاہر ہم جسے مٹی سمجھ رہے ہیں اس مٹی میں بھی فرق ہے۔

یہ مٹی اُمراء کے لیے اور ہے اور غرباء کے لیے اور............

غرباء کی یہاں بھی جگہ اتنی ہی کم ہے جتنی کہ وہاں............

یہ وہ وطن نہیں جہاں سب کے لیے اچھی مٹی دستیاب ہو............

پھر غرباء کا وطن کہاں ہے............؟؟

میں نے اس غریب کے مٹی کے گھروندے پر نظر ڈالی۔ وہ کونے میں ایک ڈھیر کے عقب میں تھا جبکہ اس دوسرے گھروندے سے بہت دور جو کہ تمام گھروندوں کے وسط میں قدرے بلندی پر تھا۔

میں نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں نور ظلمت کو ختم کیے جا رہا تھا...... اندھیرے بھاگ رہے تھے۔

مجھے روشنی چاہئیے......

میں اچانک بیمار نہیں ہوا تھا بلکہ ایک عرصہ سے جسمانی تکالیف سے دوچار تھا۔ درمیانی عرصے میں میں بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں سے ادویات لیتا اور استعمال کرتا رہا۔ اب تو حالت یہ ہو چکی تھی کہ ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ کمزوری پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ کبھی کبھار وہ دن شدت سے یاد آتے جب جسم کے اندر طاقت اور توانائی تھی۔ اب تو سب خواب سا محسوس ہوتا ہے۔ بیماری بڑھتی گئی اور پھر ایک روز میں ہسپتال جا پہنچا۔ مجھے کس نے ہسپتال داخل کرایا...... کچھ یاد نہیں آ رہا تھا...... میں سن سکتا تھا، دیکھ سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا...... مگر نہ تو بول پاتا اور نہ ہی اشارہ کرنے کی ہمت تھی۔

میرے گھر والے، عزیز رشتے دار اور دوست احباب میرے پاس حاضری لگوانے آتے...... جو بھی مجھے دیکھنے آتا میرا جائزہ لینے کے بعد میرے بیٹے سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا ...... جس کی مجھے سمجھ تو نہ آتی...... مگر میں ان کے چہروں کو پڑھنے کی ناکام کوشش ضرور کرتا۔ ڈاکٹروں کی ٹیم مجھ پر نت نئے تجربے کرتی...... کوئی کچھ تو کوئی کچھ کہتا...... مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اُن کی ساری مسیحائی صرف مفروضوں پر مبنی ہے......

میرے جسم سے بار بار خون لیا جاتا اور مختلف لیبارٹریوں کو بھجوا دیا جاتا۔ میں روز روز کی اِس اذیت سے عاجز آ چکا تھا...... وہ شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے خون کا گروپ O+ve ہے ۔جس کی دستیابی عام اور آسان ہے...... مجھے وہ دن یاد آنے لگے جب کبھی کسی کو خون کی ضرورت پڑتی تو ہم سب دوست بھاگے بھاگے خون کا عطیہ دینے پہنچ جاتے۔ اب وہی خون بار بار نکال کر

معائنہ کیا جارہا ہے جس خون نے کئی زندگیوں کی شمعیں روشن کیں۔ مجھے بار بار خون کا معائنے کے لیے بھجوانا بالکل بھی پسند نہ تھا مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا......

مجھے بچپن کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ وہ دن میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب مجھے والد اسکول داخل کروانے کے لیے لے گئے۔ اس دن میں نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ مجھے جوتے، بستہ، کتابیں سب کچھ نیا خرید کر دیا گیا تھا۔ جب میں واپس لوٹا تو گھر میں قدم رکھتے ہی میری والدہ قدرے تیز قدموں سے میری جانب لپکیں۔ مجھے دِل سے لگا کر میرا ماتھا چومتے ہوئے بولیں ''میرا بیٹا پڑھ لکھ کے آیا ہے......''

پھر میرے برتھ ڈے پر والد صاحب کا جوش وخروش، والدہ کا مسکراتا چہرہ، بہن کا کبھی برآمدے میں تو کبھی سجے سجائے کمرے میں بار بار چکر لگانا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوب اچھل کود کرنا...... کیک کاٹتے ہوئے میرے دوستوں اور بہن کی سہیلیوں کا جوش وخروش...... یہ سب کچھ کل کی بات لگتا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ موسم نسبتاً گرم تھا۔ والدہ نے روزے سے منع کیا جبکہ والد عادت بن جانے کی غرض سے اصرار کر رہے تھے۔ میں نے جیسے تیسے روزہ رکھ لیا۔ میری عمر بے حد کم تھی......شاید چھ سال کے لگ بھگ......عصر کی اذان ہوئی تو میرا روزہ افطار کرنے کو سخت جی کر رہا تھا مگر والدہ میرا دل بہلاتی رہی۔ والد مجھے اپنے ساتھ بازار لے گئے اور وہاں سے مختلف پھل لے کر دیئے۔ وہ میری پیاس سے آگاہ تھے اسی وجہ سے وہ میری توجہ مختلف جانب مبذول کیے جا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں اپنے حصے کے آم ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں بار بار اُچھال رہا تھا۔ ان دِنوں ہمارے محلے میں کسی کے گھر بھی فریج نہیں تھا۔ برف کے لیے بازار ہی جانا پڑتا تھا......آج والد صاحب برف کچھ زیادہ ہی لے آئے تھے۔ میں اپنے آم اسی برف میں ٹھنڈے کر رہا تھا۔ جوں جوں مجھے پیاس ستاتی توں توں میں برف آموں والی بالٹی میں ڈالتا گیا۔

جب میری چھوٹی بہن نے بھی اپنے آم اسی بالٹی میں ٹھنڈے کرنے کی ضد کی تو میرا اس سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ میری ایک ہی رٹ تھی......کیا اس کا روزہ ہے؟

والدہ گویا ہوئیں ''بیٹا! اس کا روزہ نہیں ہے لیکن یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے''۔

والدہ نے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا ''بیٹا! صبر کرو، روزے کا مقصد تو صبر کرنا ہے''۔

زندگی گزرتی گئی......ہم جوان ہوئے......بہن اپنے گھر کی ہو گئی۔ اس دِن ہمارے گھر میں بڑی اداسی تھی۔ والدین خاموش بیٹھے گم سم کافی دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جبکہ مجھے بھی گھر سونا سونا لگنے لگا تھا۔ پھر میری شادی کا دن بھی آیا۔ والدین کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ گھر میں رشتہ داروں، محلے داروں اور تعلق داروں کا تانتا بندھا ہوا تھا،۔ کچھ سالوں بعد مجھے اللہ رب العزت نے ایک بیٹے کے بعد بیٹی سے نوازا۔

جب والد صاحب ہمیں زیست کے سفر میں اکیلا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تو ہر جانب ویرانی ہی ویرانی محسوس ہونے لگی۔ والدہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ والد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد والدہ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں......

کچھ دِنوں کے سوگ کے بعد ضروریات اور خواہشات میں ایسا اُلجھا کہ کبھی کبھار ہی والدین کی یاد آتی۔ پہلے پہل والدین کی قبر کی زیارت کرنے جاتا رہا پھر بات ہفتوں سے مہینوں اور مہینوں سے سال تک جا پہنچی......رفتہ رفتہ عید پر بھی جانا محال ہوتا گیا۔ بس گھر میں ہی دعا کر لیتے...... مجھے بچوں کی فکر لاحق ہوئی۔ بیٹی کی تعلیم اور اچھے خاندان میں اس کی شادی، بیٹے کا بہتر مستقبل اور بڑے عہدے پر تعیناتی کی خواہش میرے خوابوں کا محور بن چکی تھی۔

خواہشات اور خوابوں میں یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ زندگی تو گزر چکی ہے......سیاہ بال سفید، سرخ رنگت گندمی، مضبوط اعصاب کمزور اور جسم کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ اب ڈاکٹروں کے ہاں تسلسل سے جانا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دِنوں بعد گھر والے بھی تنگ پڑنے لگے۔ بظاہر میرا

خیال رکھنے والے اندر ہی اندر کچھ اور سوچ رہے تھے۔ ان کا ڈاکٹروں سے رابطہ بھی تھا۔ ایک دن میں نے خود سنا کہ کوئی کہہ رہا تھا ''پندرہ دِن مزید زندہ رہیں گے تو کیا ہوگا؟ بس دعا کریں کہ اللہ سنبھال لے۔ سخت اذیت میں مبتلا ہیں''۔

پھر دعا کی گئی کہ اللہ مجھے سنبھال لے''......وہ دن مجھ پر بے حد بھاری گزرا۔

دوسرے دن سب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ انہیں گھر لے جائیں۔ میں گھر جانا چاہتا تھا مگر تکلیف تھی کہ دُور ہونے کا نام نہ لیتی تھی...... جو کھاتا اُلٹ دیتا......میرا معدہ خوراک کا طالب تھا مگر میرا حلق خوراک کا دشمن......منہ میں پانی رکھا تو حلق نے زور سے واپس بھیج دیا......کئی دنوں سے رفع حاجت نہ کر سکنے کی وجہ سے سر میں درد اور طبیعت میں عجیب بے چینی تھی......میرے دوست آتے......میرے سرہانے کھڑے ہو کر میری جانب دیکھتے تو ان کے چہروں پر افسردگی واضح ہوتی اور کچھ کی نظریں ملتے ہی آنکھیں چھلک پڑتیں......اُنہیں دیکھ کے میرا دِل بیٹھنے لگتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرے وجود میں بے چینی بڑھتی ہی گئی......ہسپتال والوں نے صاف جواب دے دیا مگر میرے گھر والے سب باتیں مجھ سے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ جب میرے بڑے بیٹے نے مجھے گھر جانے کا کہا تو مجھے بہت بُرا لگا۔ میں نے اُس کی جانب حیرت سے دیکھا......میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بیمار ہوں۔

وہ میری نظروں میں پوشیدہ سوال پڑھ چکا تھا۔ میری ڈھارس بندھانے کی خاطر بولا ''آپ ٹھیک ہو جائیں گے......ڈاکٹروں سے میری بات ہو چکی ہے......وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کا علاج گھر پہ مناسب رہے گا''۔

پھر مجھے اٹھا کر کرسی پہ ڈالا گیا۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ جب کرسی چلائی گئی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی سرکس میں گھومنے والے پنگھوڑے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے جیسے تیسے گھر پہنچایا گیا۔ محلے داروں، تعلق داروں کا جم غفیر تھا۔ کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ......

میرے سامنے میرا بیٹا کچھ افسردہ سا کھڑا تھا۔ وہ جب چھوٹا سا تھا تو اُس کی توتلی باتیں

سن کر بڑا سرور ملتا تھا۔ میں جان بوجھ کر اُس سے باتیں کرتا رہتا۔ وہ ہر لفظ کے آخر میں ''ر'' اور ''ش'' کا اضافہ کرتا......ان دِنوں بجلی کم کم ہی میسر ہوتی۔ میں اس کے لیے ہاتھ والا پنکھا لے آیا تھا۔ سارا دِن اُس کی ماں، پھوپھی یا بہنیں اُسے پنکھا جھولاتیں۔ جب میں گھر میں ہوتا تو یہ کام اپنے ذمے لے لیتا۔ وہ راتیں بھی یاد آنے لگیں جب پوری رات میں اور میری شریکِ حیات اس کو پنکھا جھلتے رہتے تاکہ اُسے گرمی اور مچھروں سے محفوظ رکھ سکیں۔

سامنے کھڑی میری اکلوتی بیٹی (جس کو میں اپنے دل کا ٹکرا سمجھتا تھا) میرے چہرے کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھیلی افسردگی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے پہ غم کی لہر واضح نظر آ رہی تھی۔

اس لمحے مجھے اپنی شریکِ حیات کی یاد شدت سے آنے لگی جو مجھے زندگی کے اِس سفر میں داغِ مفارقت دے گئی تھی......وہ ہوتی تو بے حد شور مچاتی۔ وہ میری ذرا سی تکلیف پہ چلا اٹھتی تھی۔

میرے پورے وجود میں صرف آنکھیں تھیں جو میری زندگی کے آثار کا پتا دے رہی تھیں۔ کوئی میرے جسم کو ہاتھ لگاتا تو قدرے سکون محسوس کرتا ورنہ پورا جسم ہی سُن ہو چکا تھا۔ چھو لینے پر اپنے ہونے کا احساس ہوتا......میں اپنی بیٹی اور بیٹے سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں طویل عرصہ اُن کے ساتھ گزارنے کا متمنی تھا۔

اب مجھ پر غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ کئی کئی گھنٹے مجھے ہوش نہ رہتا تھا۔ جب قدرے سنبھلتا تو بچوں کے افسردہ چہرے میرے سینے میں آگ لگا دیتے۔ سب مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود بول نہ پاتا تھا۔

سامنے دیوار پہ میری جوانی کی تصویر آویزاں تھی جس میں میرے مسکراتے دانت واضح طور دکھائی دے رہے تھے۔ میرے پہلو میں بیٹا کھڑا تھا اور گود میں بیٹی تھی۔ یہ تصویر غالباً بیس برس پہلے کی تھی۔ اِس بستر پر پڑے پڑے مجھے بیس برس بیت گئے تھے...... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

ان بیس برسوں میں کوئی ایسا قابلِ ذکر کام نہ تھا جو مجھے یاد آ رہا ہو۔بس زندگی کے شب و روز کی گنتی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

مجھے ہسپتال سے گھر آئے پانچ دن گزر چکے تھے۔اب میرے سرہانے بیٹھ کر کچھ لوگ تلاوت کر رہے تھے ۔ سامنے بیٹھی میری بھانجی زیرلب کچھ پڑھ رہی تھی۔ میرا لاڈلا بیٹا کہاں ہے؟؟ میری نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں......شاید وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

شاید مجھ پر غنودگی غالب آنے لگی تھی۔ میں اپنی آنکھیں کھولنا چاہتا تھا مگر وہ کھلنے سے قاصر تھیں۔سب لوگ اونچی اونچی آواز میں کلامِ پاک پڑھے جا رہے تھے۔میرے کان کے ساتھ کسی نے اپنے ہونٹ لگائے...... مجھے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں سنائی دیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کو بہت زور لگانے کے بعد کھولا۔اِس پل مجھے ایسا لگا کہ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ پھیل رہی ہے،۔سب کے سب اندر سے بے حد خوش ہیں......پھر نہ جانے انہیں کیا ہوا...... ہر ایک کا چہرہ غم سے افسردہ ہونے لگا...... جب میری سانسیں ڈوبنے لگیں تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

مجھے ایک چیخ سنائی دی......کسی نے دور سے میرے بیٹے کو صدا لگائی......وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آ کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگا،......میری اکلوتی بیٹی کی آنکھوں سے آنسو میرے قدموں پہ گر رہے تھے......اس کے گرم گرم آنسوؤں کو میں نے اپنے پاؤں پر محسوس کیا تھا۔کان کے ساتھ ہونٹ لگائے کوئی شخص نبی آخرالزمان رسول برحق ہونے کی شہادت دے رہا تھا۔

میں سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب صبح سویرے میں کھلی فضا میں کھڑے ہو کر سورج کی کرنوں کو غور سے دیکھا کرتا تھا۔آج مجھے سورج غروب ہوتے وقت کی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھیں جو میری زندگی کی واحد نشانی بتائی جاتی تھیں بند ہو چکی تھیں۔

تدفین کی تیاریاں شروع تھیں۔ میری ٹانگیں اور بازو درست کیے جا رہے تھے۔

میرے ہونٹوں اور آنکھوں پر کسی نے نرم گرم ہاتھ پھیرے......انگلیاں سیدھی کی گئیں...... مجھے غسل دیا جانے لگا......کفن پہنا کر خوشبوئیں چھڑکی گئیں۔ مجھے اِن تمام مراحل سے میرے چاہنے والوں نے اچھی طرح سے گزارا...... دوسری جانب بہت سے افراد اپنی گھڑیوں کو بار بار دیکھے جا رہے تھے۔شاید میرا دنیا میں مزید قیام اُن کے لیے ناگوار تھا، وہ جلد از جلد مجھے مٹی میں ملانے کے لیے بے چین تھے، میرا بیٹا میری میت اٹھانے پہنچا تو میری بیٹی، بہن اور بھانجیاں اُس سے لپٹ گئیں مجھے بھی بے حد دکھ ہو رہا تھا...... پھر اِدھر اُدھر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں......اٹھاؤ...... اٹھاؤ......چلو چلو......وقت کم ہے......وقت کم ہے......لوگ انتظار کر رہے ہیں......

میری نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور تدفین کے عمل میں سب شریک ہوئے، جب مجھے قبر میں اتارا گیا تو کسی نے میرے بیٹے کو آواز دی......اپنے والد کا آخری دیدار کر لو شاید اب تمہیں خوابوں میں ہی ملے......میرے چہرے سے تھوڑی دیر کے لیے کفن ہٹایا گیا پھر کفن کی گرہیں کھولی گئیں، میرے اوپر سل رکھنے کا عمل شروع ہو چکا تھا،سوراخوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے جا رہے تھے اور سلوں پہ منوں مٹی کا وزن...... کسی نے میری قبر کے سر والی جانب بڑی سل گاڑ دی تھی، سارے سوراخ بند کیے جا رہے تھے۔مٹی مٹھیاں بھر بھر ڈالی گئی،عطر کا چھڑکاؤ ہوا، میرے بیٹے نے قبر پہ پھول کی پتیاں ڈالیں......پھر آہستہ آہستہ سب چلتے بنے......

رات ہوئی تو میری قبر اندھیرے میں ڈوب گئی......سب جانتے ہیں مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے......تب مجھے دُور بہت دُور سے روشنی آتی دکھائی دی...... یہ روشنی اسی طرح کی تھی کہ جب کوئی کسی ویرانے اور اندھیرے میں سفر کرے تو دور کی روشنی کس قدر اطمینان بخش ہوتی ہے۔روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی......اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ میری قبر میں پہنچ گئی...... روشنی دو ہاتھوں میں اٹھایا ہوا ایک دِیا تھی...... میں نے ہاتھ پہچان لیے۔ یہ میری بیٹی کے ہاتھ تھے۔ میں نے اُسے جھڑکا کہ اتنی دیر سے دِیا کیوں لائی ہو؟......وہ دِیا مجھے پکڑا کے بغیر بات کیے واپس لوٹ گئی۔

دوسرے دن پھر قبر میں اندھیرا تھا۔ میں اپنی بیٹی کی راہ تکتا رہا مگر وہ دِیا نہ لائی......کچھ دنوں بعد دِیا اسی طرح سے میرے پاس لایا گیا۔ اس بار میری بیٹی کی بجائے بیٹا تھا۔ میں نے بیٹے سے قدرے تُرش لہجے میں کہا کہ مجھے روزانہ روشنی کا دِیے کی ضرورت ہوتی ہے......تم روزانہ دِیا لایا کرنا......وہ ایک دِیا میرے حوالے کر کے بغیر بات کیے لوٹ گیا۔

اب مدتیں گزر چکی ہیں۔ میری بیٹی اور بیٹا نجانے کہاں ہیں؟ وہ دِیا لے کر نہیں لوٹے......میرے اڑوس پڑوس جب کبھی دیا جلایا جاتا ہے تو روشنی کی ہلکی سی رمق میری طرف بھی آتی ہے......اور میں اپنی قبر میں چلاتا رہتا ہوں......؟ مجھے روشنی چاہیئے ...... مجھے روشنی چاہیئے ۔

مٹھائی

سخت گرمی پڑ رہی تھی لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے ۔کچھ اپنے گھروں کے تہہ خانوں میں لیٹے ہوئے تھے۔شاذ ہی کوئی اِدھر اُدھر آتا جاتا نظر آتا مگر خان افضل خان کے حجرے میں افراد کی کثیر تعداد موجود تھی ۔ پرتکلف کھانے کھا چکنے کے بعد کوئی نماز کی ادائیگی کوئی وضو کرنے میں مصروف تھا۔کچھ گرمی کی شدت سے بیزار نہانے کے لیے باتھ روم خالی ہونے کے انتظار میں نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

سامنے بڑی چارپائی پر خان افضل خان براجمان تھا۔

کونے میں بیٹھا الطاف علی بولا......''جو ہو رہا ہے یہ کام پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا''۔

سلیم نے الطاف علی کی جانب غور سے دیکھا اور آنکھوں کے اشارے سے اثبات میں سر ہلایا۔الطاف علی اپنی چارپائی کو گھسیٹتے ہوئے کونے میں لے جانے لگا تو سلیم بولا......''الطاف علی! چلو اٹھو......وہاں اِس چارپائی پہ جا کر بیٹھتے ہیں''۔

دونوں کونے میں جا کر بیٹھ گئے......سامنے شیشے کی بڑی الماری میں جدید اسلحہ پڑا تھا جبکہ دوسری جانب خان افضل خان کے والد مرحوم خان بہادر خان کی بڑی تصویر آویزاں تھی۔ دونوں کی نظریں تصویر پر جا ٹھہریں......کشادہ چہرہ،موٹی مونچھیں،گھنی داڑھی اور سر پر پگڑی سرخ وسفید چہرے کو مزید بارعب بنا رہی تھی......چاروں اطراف سنہرے رنگ کا فریم تصویر کی خوب صورتی کو دوبالا کر رہا تھا۔

الطاف علی نے سلیم سے کہا''بڑے خان کی شخصیت کتنی بارعب تھی''سلیم نے تصویر پر نظریں گاڑ لیں''جوانی کی تصویر ہے ورنہ بعد میں تو بیماری کی وجہ سے خان بہادر خان بے حد کمزور

ہو گیا تھا۔سلیم نے جواب دیا۔

''ہاں ہاں...... بیماری میں کمزوری تو ہونی ہی تھی......ایک دن کی بیماری انسان کو نچوڑ دیتی ہے خان تو برسوں بستر پہ رہا تھا......''۔

اللہ بخشے جب خان ایم ایل اے تھا تو میں اپنے والد کے ساتھ کبھی کبھار حجرے میں آتا......کیا ٹھاٹھ تھے۔الطاف علی نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

اس وقت بچے تو بچے جوان بھی حجرے سے دور رہتے۔ بزرگوں کی محفل میں بیٹھنا تو بے ادبی سمجھی جاتی تھی۔سلیم نے اپنے تجربات بھی الطاف علی کے گوش گزار کیے۔

بڑا خان کم بولتا تھا مگر سچ بولتا تھا......عہد کی پاسداری کرتا تھا۔غریبوں کے سر پہ ہاتھ رکھنے والا، دریادل شخص تھا......الطاف علی نے بڑے خان کے اوصاف بیان کیے۔

بڑے خان نے سیاست سے کنارہ کشی کیوں کر لی تھی؟سلیم نے پوچھا۔

ہاں بڑے خان نے بڑے وقار سے سیاست کو خیر باد کہا تھا...... پھر بادشاہ کی بجائے بادشاہ گری کی......الطاف علی نے سلیم کو نزدیک کرتے ہوئے کہا

سلیم نے پاؤں کھجلاتے ہوئے پوچھا ''وجہ کیا تھی؟''

بڑا خان اصول پسند شخص تھا۔اُس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی کی ذات پہ حرف آئے۔کسی پر دشنام طرازی کرنا اُس کا شیوہ نہ تھا۔مخالفین نے بڑے خان کے خلاف ایک جلسے میں نازیبا الفاظ کا استعمال کیا تو بڑے خان نے پورے علاقے کو بلا کر جلسہ کیا تھا۔جس میں خان نے اعلان کیا کہ ''میں نے آپ سب کی جتنی ممکن ہوئی خدمت کی۔ میں سیاست کو عبادت سمجھتا ہوں اور اب سیاست میں بازاری زبان استعمال ہونا شروع ہو چکی ہے۔لہٰذا میں ایسی سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کرتا ہوں......''۔علاقے کے کئی لوگ رونے لگ پڑے تھے۔کئی بڑے خان کو فیصلہ بدلنے کا کہنے لگے۔مگر بڑے خان نے فیصلہ نہ بدلا۔

الطاف علی ماضی کے دریچوں میں کھویا ہوا باتیں کیے جا رہا تھا جیسے وہ اس جلسے میں بیٹھا

سارا منظر دیکھ رہا ہو......

....

کرم دار عرف کرموں باری باری لوٹے میں پانی بھر کر کسی کے ہاتھ دھلوا رہا تھا تو کسی کے پاؤں......اُس کا بیٹا وحید عرف وحیدی بھی والد کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دوسرے گاؤں کے معززین ابھی حجرے میں پہنچے تھے۔ سامنے والے کمرے سے ملحق ہال میں اُن کا کھانا بھی لگایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ نماز کی ادائیگی کے بعد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بعض موجودہ حالات اور آنے والے وقت کے اندازے لگا رہے تھے، کئی ہم خیال سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایک بولا......''چھوٹا خان مخصوص لوگوں کے کام کرتا ہے۔ اِس میں بڑے خان والی کوئی بات بھی نہیں......''

ساتھ بیٹھا شخص بولا......''اتنے بڑے علاقے کے ہر ایک فرد کو بھلا راضی بھی کون کر سکتا ہے؟ لوگ بھی کمال ہی کرتے ہیں۔ جتنے کام انہوں نے علاقے کی ترقی کے لیے کیے ہیں کوئی اور بتاؤ جس نے کیے ہوں......؟''

خان افضل خان حجرے سے نکل کے ساتھ والی بڑی حویلی میں چلا گیا......اب باری باری معززین علاقہ وہاں جا رہے تھے۔

....

میں ماجد علوی کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس کی صورت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ چند دن قبل تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا پھر اچانک اِس قدر لاغر؟؟

کیوں علوی صاحب!......کیا ہوا؟

پیٹ میں درد ہے......جو کھاتا ہوں الٹ دیتا ہوں...... ماجد علوی نے کراہتے ہوئے کہا۔

پانی اُبال کے پیا کرو......گندا پانی ہی بیماریوں کی بنیادی وجہ ہے......میں نے ایک نظر

سامنے پڑے جگ کو دیکھا جس میں موجود پانی کی سطح پہ کئی ذرات تیر رہے تھے......میں نے اُس سے دوا کے متعلق استفسار کیا۔

علوی نے جواب میں میز پہ رکھی مختلف اقسام کی گولیوں اور سیرپ کی جانب اشارہ کیا۔

''کچھ فرق پڑا......''میں نے پوچھا

کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔ پیٹ میں مروڑ ہیں۔علوی نے پیٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

کھڑکی کھول دوں تا کہ تازہ ہوا آئے......میں نے کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

گرمی سے کمرے کے اندر حبس تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔شام ہونے کو تھی۔تپش کسی قدر کم تھی اور ہوا کمرے کو کسی حد تک معتدل کر رہی تھی۔

کیا آپ کا بیٹا آیا؟ میں نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کر ماجد علوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ہاں!ایک دن آیا تھا پھر نہیں آیا......ماجد علوی نے قدرے بیزاری سے کہا۔

میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ ماجد علوی نے میری بات کاٹتے ہوئے وہ باتیں کرنا شروع کر دیں جو عموماً وہ کرتا رہتا تھا۔

''میں نے ساری زندگی بیرونِ ملک گزاری۔لاکھوں ڈالر کمائے۔دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں میں نہیں گیا۔مگر اللہ کی آزمائش کہ بیوی اچھی نہ ملی۔آج کرائے کے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں......نہ تو میرا بیٹا میرا ہے نہ ہی میری بیٹی اور نہ ہی میری بیوی......''

وہ چھت کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''کوئی بات نہیں وہ لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس یہ رشتے بھی نہیں ہوتے''......میں نے کرسی اُس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

کمرے میں کافی گندگی پھیلی ہوئی تھی۔سامنے پڑی گولیوں پر بھی دھول تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے برسوں بعد اِس کمرے کا دروازہ کھولا گیا ہو۔

ماجد علوی نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ کوئی گارنٹی نہیں ہے۔نہ زندگی کی نہ سکون وعزت کی...... میں نے سکون کی خاطر دولت کمائی تھی...... دنیا کے ہر ملک کی خاک چھانی مگر آج ٹکے ٹکے کا محتاج ہوں...... بھلا ہو ساتھ ہوٹل والوں کا............

''نہیں نہیں!......ایسی بات نہیں''...... میں نے ماجد علوی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا...... جو اپنی چمک کھو بیٹھا تھا اور اس پر پیلاہٹ اور کمزوری واضح تھی۔

ماجد کے گلے شکوے جاری رہے۔وہ اپنی قسمت کا اپنے بیوی بچوں کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا...... کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے اجازت چاہی...... جب ماجد علوی سے ہاتھ ملایا تو اُس کا ہاتھ آگ کی طرح تپتا محسوس ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے ہاتھ میں انگارے تھام لیے ہوں۔

....

خان افضل خان کے ہاں آس پاس کے گاؤں کے ذمہ داران آنے والے انتخابات کے بارے میں اپنی رائے اور ووٹوں کی تفصیلات پر گفتگو کیے جا رہے تھے۔گفتگو میں وہ بھی شامل تھے جو مملکت خداداد میں اسلام کا پھریرا لہرانے کے داعی تھے۔

محمد ابرار علی جواب کسی حد تک مولوی محمد ابرار علی کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔سر پہ پگڑی، بڑی داڑھی، کٹی ہوئی مونچھوں، بڑے کرتے اور ہاتھ میں تسبیح لیے علاقائی تفصیلات بتا رہا تھا۔

کچھ دور بیٹھا الطاف علی بولا...... سلیم ......او سلیم!...... دیکھو یہ محمد ابرار علی کس قدر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔

سلیم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا ''الطاف علی! کوئی بھی سیاسی سچ سننا پسند نہیں کرتا......''

الطاف نے قدرے منہ بناتے ہوئے کہا ''مگر اس سے کیا گلہ؟ اس کے بڑے بھائی کی آنکھیں جونہی بند ہوئیں تو اِس نے یتیموں کی جائیداد ہتھیا لی۔ جب گاؤں کے چند افراد نے کہا

کہ یہ ظلم ہے تو کہنے لگا مدرسہ بنا رہا ہوں۔ جب بچے بچیاں علم حاصل کریں گے تو بھائی صاحب کی روح کو ثواب ملتا رہے گا۔ اور یوں یتیموں کی زمین پر ایک عالی شان مدرسہ تعمیر ہو گیا......

''مدرسے کی تعمیر میں خان افضل خان نے بھی تو دل کھول کے چندہ دیا تھا......سلیم نے کہا۔

''ہاں چندہ تو دیا تھا......'' ......الطاف نے قدرے بے زاری سے کہا۔

بڑے گاؤں کے ملک نے خان افضل خان کو اپنے گاؤں کے حالات اور عوامی سوچ سے متعلق آگاہ کیا......جو بھی آتا سب اچھا کی رپورٹ دیئے جاتا۔ خان افضل خان بے حد خوش تھا اُس کا چہرہ کھلے جا رہا تھا۔ اسے ایوان اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگا۔

سامنے والے گاؤں کے نمبردار نے پہلے تو خان افضل خان کی مدح سرائی پر کافی وقت صرف کیا پھر آئندہ انتخابات میں کامیابی کی یقین دہانی کرواتے ہوئے اجازت چاہی......

سلیم اور الطاف علی کو کسی کی بات ذرا نہیں بھاتی تھی......وہ آپس میں اسی طرح مسلسل لوگوں کی باتوں پر تبصرے کیے جا رہے تھے۔

اس بار چھوٹے خان کا انتخابات میں جیتنا محال ہے......سلیم نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ الطاف نے بھی اپنا کان مزید سلیم کی طرف جھکا لیا......دونوں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

کرموں چاچا نے سب کو چائے دینا شروع کر دی...... کچھ مہمان چائے کی بجائے قہوے کی فرمائش کرنے لگے تو کرموں چاچا کا بیٹا سامنے باورچی خانے میں قہوہ بنانے چلا گیا۔

....

آج ماجد علوی کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ اُسے کمرے سے ملحق ہوٹل کے ملازم ہسپتال لے گئے جہاں ڈاکٹروں نے اُس کا مکمل معائنہ کیا اور اسے ہسپتال میں داخل کر لیا تھا...... اس کے داخل ہونے کے بعد وہ واپس لوٹ آئے تھے مگر اس کے پاس کوئی بھی نہ ٹھہرا تھا۔

....

حکومت نے نئے انتخابات کے لیے عملے کی ڈیوٹیاں لگانا شروع کر دی تھیں۔ پھر وہ

دن بھی آیا جب لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے پولنگ اسٹیشنوں پر ووٹ ڈالنے کے لیے قطاروں میں کھڑے تھے۔

میرے آگے میرا دوست قمر علی کھڑا تھا...... ماجد علوی ہم دونوں کا پرانا مشترکہ دوست تھا......قمر علی کے موبائل پہ گھنٹی بجی...... ہیلو! اسلام وعلیکم......قمر علی نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا...... پھر اُس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا......دوسری جانب سے مکمل تسلی ہونے پر خدا حافظ کہتے ہوئے فون جیب میں ڈال کر پیچھے مڑتے ہوئے مجھے کہنے لگا...... یار ماجد علوی فوت ہو گیا ہے

ماجد علوی...... میرا جسم کانپ اٹھا...... ماجد علوی کی عمر تو کچھ نہ تھی...... چند روز قبل ہشاش بشاش ہمارے ساتھ گفتگو کیا کرتا تھا...... پھر ایک پیٹ کے درد سے فوتگی...... میں سوچوں میں ڈوب گیا......قطار بہت لمبی تھی...... ہماری باری بہت دور تھی۔مناسب یہی سمجھا کہ ہم ووٹ ڈالے بغیر قطار سے نکل جائیں اور مشاورت سے یہی طے ہوا......میرے دماغ میں خیالات کا سمندر اُمڈ آیا......

وہ ماجد جو دنیا گھوما......جس نے لاکھوں ڈالر کمائے......جس کی شادی ہوئی......اللہ نے اولاد سے نوازا......آج کس کسمپرسی کے عالم میں اِس دنیا سے سفرِ آخرت پہ چل نکلا......

ہم اُس کمرے کے پاس جا پہنچے جہاں وہ رہا کرتا تھا...... چند افراد کھڑے تھے......اُن کی گفتگو کا محور بھی ماجد علوی ہی تھا...... پوچھنے پر پتا چلا کہ بیٹا میت آبائی گاؤں لے گیا ہے......اور جنازہ رات نو بجے ہوگا۔

....

شام کے وقت انتخابی نتائج آنا شروع ہو گئے۔خان افضل خان کئی علاقوں سے تھوڑی برتری سے جیت رہا تھا۔

الطاف علی نے سلیم سے پوچھا......کیا چھوٹا خان جیت جائے گا؟

سلیم کی ایک ہی رَٹ تھی...... ’’نہیں نہیں......چھوٹا خان ہار جائے گا‘‘۔

الطاف علی ماننے کو تیار نہ تھا...... سلیم نے الطاف علی سے بحث مناسب نہ سمجھی اور کہا چلو پتہ چل جائے گا۔ چھوٹے خان کے حجرے میں عوام کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض تو دبے لفظوں میں مبارک باد بھی دیئے جا رہے تھے۔

دوسری جانب چھوٹے خان کی خوشی دیدنی تھی۔ کئی لوگ آ رہے تھے تو کئی جا رہے تھے۔ کھانے تناول کیے جا رہے تھے۔ چائے قہوے کا دور رات گئے تک جاری رہا۔ باتوں باتوں میں ووٹوں کی جمع تفریق بھی ہونے لگی۔

''چھوٹا خان ہار گیا...... سلیم نے الطاف علی کے کان میں سرگوشی کی...... ''کیوں؟ میں نے کیا کہا تھا؟''

الطاف علی پریشان تھا۔ اُس نے سلیم سے وجہ پوچھی کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نتائج سے پہلے ہی تم چھوٹے خان کے ہارنے پہ مصر تھے۔

سلیم نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا ''چھوٹے خان کے گرد وہ لوگ جمع تھے جو مفاد پرست اور موقع شناس تھے۔ جنہوں نے ذاتی کام کروائے اور اپنی جیبوں کو بھرا۔ جب چھوٹا خان ان سے پوچھتا تو وہ سب اچھا کی رپورٹ دیتے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے چھوٹے خان کے نام پر لوگوں کی زمینوں پہ قبضے کیے، بھتے لیے، اپنے کئی رشتے داروں کے حق چھینے...... بھلا ان کے کہنے پر ووٹ کون دیتا۔

پھر سلیم نے افسردہ لہجے میں کہا ''میں نے چھوٹے خان کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ غصے سے بولا تھا کہ تمہیں سیاست کی الف بے کا کیا پتہ ہے؟''۔

دوسرے دن الطاف علی اور سلیم نے دیکھا کہ خان افضل خان کو مشورے دینے والے ہار اور مٹھائی کے ڈبے لیے مخالف کو جیت کی مبارک باد دینے جا رہے تھے۔ سلیم نے الطاف علی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ نہیں مان رہا تھا مگر دوسرے ہی دن سلیم اور الطاف علی مٹھائی کی ٹوکری اٹھائے پھولوں سے سجائے اسی جانب جا رہے تھے جدھر ایک دن قبل دوسرے لوگ جا رہے تھے۔

مسکراہٹ

ملک سردار خان ایک منجھا ہوا سیاستدان ہی نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ نفسیات دان اور چہرہ شناس بھی تھا۔وہ ہر طرح کے ماحول میں فوراً ہی خود کو ڈھال لیتا۔لفظوں کی جادوگری اور جملوں کی ادائیگی کا فن خوب جانتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ محلے کے کونسلر سے بڑھتا بڑھتا آج صوبے کا وزیر بن چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا کر مقاصد کی تکمیل اُس کا نصب العین تھا......آج وزارت کا قلم دان سنبھالنے کے بعد وہ اپنے شہر میں آ رہا تھا جہاں اس کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔اِس شہر کے باسیوں نے اُس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔اتنی بھاری تعداد میں اُسے ووٹ ملے کہ وہ خود بھی حیران تھا۔

گرج دار نعرے اور ڈھولک کی تھاپ پر عوامی نمائندے پنڈال میں آ رہے تھے۔جونہی کوئی سیاسی رہنما نمودار ہوتا سٹیج سے زوردار نعرے لگانے کا اعلان ہوتا اور چند افراد سامنے میز پر پڑے ہاروں کے انبار سے ہار اٹھا کر اپنے رہنما کی جانب بھاگتے۔جم غفیر کی نگاہیں بھی ان کا تعاقب کرتیں۔ پہلے ہی ہاروں سے لدا ہوا رہنما مزید ہار پہنتے ہوئے سٹیج کی جانب بڑھتا۔نعرے اور تالیاں اُس کا استقبال کرتیں وہ دونوں بازؤں کو ہجوم کی طرف پھیلا کے نعروں کا جواب دیتا۔سٹیج پر بیٹھے اور ارد گرد کھڑے تمام افراد سے مصافحہ یا معانقہ کرتے ہوئے اپنی نشست پر براجمان ہو جاتا۔یہ رہنما آپس میں سرگوشیاں کرتے،آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتیں، اشارے ہوتے،ہجوم کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

انتظامیہ کو بھی انگلیوں کے اشاروں اور انگوٹھے کے مخصوص انداز سے شاباش دی

جاتی...... جلسے میں خوب ہلچل تھی ۔نعرے لگانے والے تھکتے تو سامنے بیٹھے مختلف سرکاری اور نجی اسکولوں کے طالب علم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ۔مختلف اسکولوں کے طلباء حمد ونعت اور نظموں سے حاضرین کو بیٹھے رہنے پہ مجبور کیے ہوئے تھے جب کہ اکثریت تو اب اُکتا چکی تھی ۔ کہاں صبح کے دس بجے کا وقت اور کہاں دو پہر کے دو بج رہے تھے مگر وزیرِ موصوف کی آمد کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے ۔ کئی افراد آپس میں باتیں کر رہے تھے، ۔کئی بزرگ اور نوجوان سگریٹوں کی ڈبیاں پھونک چکے مگر جلسہ شروع ہونے کا ابھی بھی کوئی وقت طے نہ ہوا تھا۔ منتظمین میں سے کوئی موبائل پہ رابطہ کرتا تو سب کی توجہ اُس کی جانب ہو جاتی ۔ پھر سٹیج سے اعلان ہوتا '' حاضرینِ محفل ! ہم آپ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور پروگرام میں خوش آمدید کہتے ہیں ۔ ہمارے قائد آپ کے قائد بس چند ہی لمحوں میں ہمارے درمیان ہوں گے...... ''۔

جو اکابرین سٹیج پر پہنچ چکے تھے اُن میں رکن قومی اسمبلی علی ہمدانی، رکن صوبائی اسمبلی احمد انصاری، سر پرست بلدیہ ملک نور محمد، سماجی رہنماؤں میں نظیر احمد علی اور علی اکثر عباسی تھے ۔ پھر ایک گونج دار آواز آئی '' حاضرینِ محفل ! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، وزیرِ موصوف ملک سردار خان شہر میں داخل ہو چکے ہیں ۔

حاضرین مختلف اعلانات سن سن کر اُکتا چکے تھے ۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا '' شہر بہت بڑا ہے...... کیا معلوم موصوف کہاں پہنچے ہوں گے؟ ''۔ پھر سٹیج سے آواز آئی '' بس چند ساعتوں میں وزیرِ موصوف پہنچ رہے ہیں ۔نعروں کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ میں بیٹھا بیٹھا تھک چکا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ جیب سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ صاف کیا...... سگریٹ نکالا اور سلگانے کے لیے ماچس ٹٹولنے لگا ۔اسی دوران پولیس کی گاڑیوں کے حصار میں کالے شیشوں والی گاڑی پنڈال میں داخل ہوئی...... خصوصی پولیس کے اہلکاروں نے گاڑی کو گھیر لیا ۔عوام کو ٹھاٹھیں مارتا سمندر اٹھ کھڑا ہو گیا ۔نعرے بازی اتنی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ۔تالیوں کی گونج میں سامنے والی عمارت سے جدید ترین اسلحہ سے فائرنگ بھی شامل ہو

گئی تھی۔ دوسری طرف سے برسٹ داغے جا رہے تھے،۔سٹیج کی ایک جانب کھڑے طلباء و طالبات نے کبوتروں کو ہوا میں اچھال دیا۔ایک نجی اسکول کے طلباء نے غباروں سے فضا کو رنگین بنا دیا۔وزیرموصوف کو حصار میں سٹیج تک پہنچایا گیا۔باضابطہ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔تلاوتِ کلام پاک مقامی مسجد کے خطیب نے کی۔سپاس نامہ سرپرست بلدیہ ملک نور محمد نے پیش کیا جس میں تمام تعلیمی نظام کی ابتری، اسکولوں کی حالت زار، پانی کی فراہمی،شہر میں بجلی کی بندش کے خاتمے،سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت جیسے مسائل شامل تھے۔

اراکینِ صوبائی اسمبلی نے اپنی تقاریر میں کئی سہانے خواب دکھائے اورتعبیر کے وعدے کیے جبکہ سرپرست بلدیہ ملک نور محمد جس نے وزیرموصوف کی بھرپور حمایت کی تھی اوراسی وجہ سے وزیرموصوف کو بھاری تعداد میں ووٹ بھی ملے،اپنے علاقے کے مسائل کوترجیحی بنیادوں پرحل کروانے کے لیے کمربستہ تھے۔عوامی توقعات کے عین مطابق مسائل کی نشاندہی کی اورخوب داد وصول کی۔

میری پچھلی نشست پر بیٹھے افراد ہر جملے پر اختصار سے آپس میں ضرور بات کرتے......ایک نے کہا ''دیکھا ناں!......ملک نورمحمد مرد ہے......مرد...... ہر بات صاف کرتا ہے۔دوسرے نے کہا''جو باتیں ہمیں کرنی چاہئیں تھیں وہ سب ملک نور محمد نے کردیں ہیں۔پھر سماجی رہنما نظیر احمد علی نے سرپرست بلدیہ کی تقریر کو ہی آگے پیچھے کر کے بات ختم کی۔ایسے لگا جیسے آج وہ صرف حاضری لگوانے آیا ہو۔جبکہ علی اکثر عباسی نے اپنی تقریر میں صرف وزیرموصوف کی صفات بیان کر کے حقِ نمک ادا کیا۔

میں نے تقریروں سے توجہ ہٹا کرعوامی چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔کوئی مقررین کو دیکھ دیکھ کر ہنسے جارہا تھا......کوئی اتنا محو تھا کہ اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔بعض تو ایسے بھی تھے جو بات پوری ہو نہ ہو تالیوں اورنعروں کی ادائیگی اپنا فرضِ عین سمجھتے تھے۔بعض گہری سوچوں میں جلسہ گاہ میں موجود ہونے کے باوجود موجود نہ تھے۔بعض افراد پورے جلسے میں صرف چہل قدمی کر رہے

تھے اور کبھی کبھی کھڑے ہو کر دو چار باتیں بھی سنتے اور پھر اِدھر اُدھر چلنا شروع کر دیتے۔ کئی افراد نے اتنے دور سے نعرے لگائے کہ گلے خراب کر بیٹھے۔ کئی اونچی آواز نکالنے کی کوشش میں تھوک دوسروں کے چہروں پہ ڈالے جا رہے تھے کئی صرف سٹیج کی جانب متوجہ تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ نعرے بند ہوں وہ صرف باتوں پر غور کیے جا رہے تھے......

جبکہ وزیر موصوف سب پر طائرانہ نظر ڈالتے اور مسکراہٹوں سے سب کو جواب دیتے پھر وہ لمحہ آن پہنچا جب گونج دار نعروں میں وزیر موصوف ملک سردار خان مائک کے سامنے آ کھڑا ہوا......

کچھ دیر شدید نعرہ بازی ہوتی رہی وہ ہاتھوں کو لہرا لہرا کے جواب دے رہا تھا پھر ہاتھ کے اشارے سے نعرے بازی کرنے والوں کو خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کیا اور تقریر شروع کی......

میرے بزرگو......! میرے بھائیو......! میری بہنو......! اسلام وعلیکم

آج کا یہ لمحہ میری زندگی کا سب سے بہترین لمحہ ہے جبکہ میں اپنے محبت کرنے والے بزرگوں، بھائیوں اور بہنوں سے بات کر رہا ہوں۔ ہر طرف خاموشی، نعرے تھم گئے، شور ختم ہو چکا تھا......

سب کی توجہ سٹیج کی جانب تھی مرد و زن، طلباء و طالبات بڑے انہماک سے وزیر موصوف کو سن رہے تھے، وزیر موصوف نے حکومتی پالیسیوں، آنے والے وقت میں اپنی ترجیحات، مسائل کے حل کے لیے اپنی کوشش کے ساتھ سپاس نامے میں سرپرست بلدیہ کی جانب سے اٹھائے گئے تمام مسائل کے حل کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے حل کی یقین دہانی کروائی۔

جونہی تقریر ختم ہوئی ہجوم وزیر موصوف کی جانب اُمڈ پڑا، لوگ ہاتھ ملانے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے بعض بزرگ، نوجوان مرد، عورتیں، ہاتھوں میں درخواستیں لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے، کئی افراد کے کپڑے پھٹ گئے، کئی درخواستیں ہاتھوں سے گر پڑیں، کئی

پاؤں کچلے گئے، کئی دھکوں کی نذر ہوئے، انتظامیہ اور خصوصی اہلکاروں نے لوگوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا......اور وزیرِ موصوف کو گاڑی کی جانب لے جانے لگے، شازیہ بھی محلے کی عورتوں اور ہم عصر لڑکیوں کے ساتھ سامنے کی بلند عمارت سے سب دیکھ رہی تھی...... کچھ دنوں بعد اخبار کی زینت نوکری کا اشتہار بنا تو شازیہ کے ذہن میں فوراً ہی وزیرِ موصوف کے وعدے، ترقی کی باتیں، بے روزگاری کے خاتمے کے الفاظ گونجنے لگے، اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ وزیرِ موصوف سے رابطہ کر کے نوکری ضرور حاصل کرے گی حالانکہ اُس کی تعلیمی قابلیت نوکری کے مطلوبہ معیار سے بلند تھی وہ آسانی سے نوکری حاصل کر سکتی تھی مگر وہ شاید ملکی نظام سے خوف زدہ تھی جہاں اہلیت ہونے کے باوجود بھی نوکری ملنا محال ہے اُس نے محکمے کو اپنے تمام ضروری کاغذات بھیجے، تحریری امتحان دینے کے بعد وہ وزیرِ موصوف سے ملاقات کا مشورہ کرنے لگی اُس کی والدہ نے اُسے کہا کہ سفارش کے بغیر بھی تم کامیاب رہو گی......

وہ مانتے نہ مانتے دوسرے تیسرے دن محکمے کے دفتر کا چکر ضرور لگاتی جہاں سے یہی جواب ملتا کہ بہت جلد کامیاب ہونے والی لڑکیوں کی فہرست شائع کر دی جائے گی مگر وہ وقت کب آئے گا اِس کی کوئی خبر نہ تھی۔ کئی محکمے کے اہلکار شازیہ سے ہمدردی بھی جتلاتے اور وہ کیوں نہ جتلاتے......شازیہ ایک تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ خوب صورت گہری سمندر جیسی آنکھوں، سفید رنگت، لمبی مخروطی گردن، سنہری بالوں اور نسوانیت سے لبالب سراپے کی مالک تھی جو کسی کے بھی ایمان کے امتحان کو کافی تھا......

پھر ایک دن وہ محکمے کے اعلیٰ افسر کے دفتر جا پہنچی جس نے اُس سے چند باتیں سوال پوچھنے اور سرتاپا جائزہ لینے کے بعد وزیرِ موصوف سے مل لینے کو کہا......

اگلے دن شازیہ وزیرِ موصوف کے دفتر میں ملاقات کا انتظار کر رہی تھی پھر جلد ہی اُسے ملاقات کا وقت مل گیا اُس نے وزیرِ موصوف کو اپنی تعلیمی قابلیت اور گھریلو مسائل سے آگاہ کیا وزیرِ موصوف نے توجہ سے اُس کی باتیں سنیں...... بہت سے محکمانہ ضابطوں اور معاملات سے بھی آگاہ

کیا اور دوسرے دن کوٹھی پہ آنے کا کہا......

شازیہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اُسے امید ہو چکی تھی کہ اُسے نوکری ضرور مل جائے گی دوسرے دن وہ وزیرِ موصوف کی کوٹھی پہ جا پہنچی......

چند گھنٹوں کے بعد شازیہ کو پکی نوکری کا پروانہ تھما دیا گیا......شازیہ کو نوکری مل جانے کے تیسرے دن وزیرِ موصوف خاص محفل میں دوستوں سے گپ شپ لگا رہا تھا جب محکمے کے اعلیٰ افسر نے وزیرِ موصوف سے پوچھا کہ میں نے ایک لڑکی شازیہ آپ کے پاس بھیجی آپ نے تو فوراً ہی نوکری کے احکامات جاری کر دیئے تو وزیرِ موصوف نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا......اعلیٰ افسر کی آنکھوں میں چمک تھی کیونکہ وہ بھی تو وزیرِ موصوف کے خاص دوستوں میں سے تھا......!!

نشانی

اس محلے میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو دو تین نسلوں سے اس محلے کے باسی چلے آ رہے تھے مگر پانچ سات مکان ایسے بھی تھے جو کرایہ داروں کے زیرِ استعمال تھے، مہینہ دو مہینے، سال دو سال بعد کرایہ دار تبدیل ہوتے رہتے۔ پورے علاقے میں یہ محلّہ شرفاء کا محلّہ مشہور تھا جہاں شاذ ہی کوئی جرم یا اخلاقی کمزوری دیکھنے میں آئی تھی۔

یہ ایک پرانی عمارت تھی جس میں مختلف دکانداروں نے گودام بنائے ہوئے تھے پھر ایک گودام ایک عامل نے لے لیا۔ یہ عمارت اس محلے کی سب سے پرانی عمارت تھی محلے والے گزرتے وقت سوالیہ نظروں سے اس کے دروازے پر بھی نظریں گھاڑتے ہوئے گزرتے۔ ہر شخص پہلے خود سے اور پھر کسی قریبی دوست سے ضرور بات کرتا کہ یہاں کون رہتا ہے......؟ ایک دو دن میں یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی کہ یہاں عامل مختلف وظائف کر رہا ہے یوں محلے کی گلیوں میں مضافاتی گاؤں کی عورتوں کا ہجوم نظر آنے لگا ہر عمر اور رنگ و نسل کی عورتیں شامل تھیں...... بوڑھی، جوان، بچیاں...... مسائل اتنے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے...... ہر ایک مستقبل کے بارے میں سب جان لینا چاہتی تھی......

ایک گاؤں کی جوان عورت گویا ہوئی ''جناب! میری نند مجھ سے جھگڑتی رہتی ہے یہ جھگڑا کب ختم ہوگا؟

عامل (عورت کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے): بہت جلد بہت جلد

عورت: اگر مدت کا پتہ چل جاتا تو......

عامل: کہہ دیا کہ بہت جلد...... یہ تعویز خود پینا...... یہ چوکھٹ پہ باندھ دینا......اور یہ

اُس کے بستر کے پاس محفوظ جگہ پہ رکھ دینا...... جاؤ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

خبر دور دور تک پہنچ گئی مگر اہلیانِ محلّہ اس سے بے خبر تھے پھر دیکھا دیکھی محلے والیاں بھی آنے جانے لگیں۔

کوئی خاوند کی آمدنی ہتھیانے پہنچتی تو کوئی بیٹے کو مطیع وفرمانبردار بنانے۔ کوئی پرانے دردوں سے نجات پانے تو کوئی بیٹیوں کے رشتے جڑوانے...... کسی کو کاروبار کی فکر تھی تو کسی کو اولادِ نرینہ کی خواہش۔

حاجت مندوں کے کام ہوئے یا نہ ہوئے مگر عامل کے وارے نیارے ہو گئے۔ روپوں سے تھیلے بھی بھرتا رہا اور خرد و نوش کا سامان بھی اکٹھا ہوتا رہا پھر ایک دن شاہد نامی نشئی بھی اپنی والدہ کے ساتھ جا پہنچا...... عامل نے وظائف کیے اس کی باتوں اور سوالوں نے شاہد اور اُس کی والدہ پر عجیب اثرات مرتب کر ڈالے۔

عامل نے نہ صرف شاہد کے گھر کے کمروں کے نقشے بتائے بلکہ گھر والوں کی تعداد بھی گنوا دی...... ان باتوں نے شاہد اور اس کی والدہ کو عامل کا مرید بنا دیا پھر شاہد کی والدہ کا آنا جانا شروع ہو گیا...... سادہ لوح عورت نے اپنے تمام مسائل بمع وسائل عامل کو بتا ڈالے...... اور وہاں ایسے آنے جانے لگی جیسے یہ اُس کا دوسرا گھر ہو۔ جہاں جہاں عامل کا پیغام پہنچنا رہتا تھا شاہد کی ماں نے وہ کسر نکال دی ایک دن نشے کی طلب سے نڈھال شاہد عامل کے آستانے پہ جا پہنچا...... تھوڑی ہی دیر کے بعد عامل نے شاہد کو دو چار سگریٹ پی لینے کی اجازت دے دی اس بار سگریٹ عامل نے اپنے ہاتھوں سے شاہد کو دیئے...... پھر کیا تھا شاہد کی دنیا ہی بدل گئی اب وہ اپنے نشے کی عادت کو وہاں سے ہی تسکین دینے لگا پھر ایک دن اس کو حکم دیا گیا کہ وہ عامل کو اپنے گھر لے جائے اس سے بڑی خوش بختی شاہد کے گھر والوں کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی، پھر ہفتے میں دو تین دن عامل کا وہاں جانا ضروری ٹھہر گیا۔

عامل نے شاہد کی بہن کا حساب بھی کیا...... شاہد کی والدہ گویا ہوئی جناب! بتائیں اس

کے ہاتھ کب پیلے ہوں گے عامل نے ہاتھ دیکھ کر حساب کیا......شاہد کی بہن کے ہاتھ کی لکیریں بہت گہری اور واضح تھیں۔ عامل نے جلد ہی اُس کے مستقبل کی پیش گوئیاں کر دیں......شاہد خوش تھا کہ اُس کے نشوئی ہونے سے اُس کی بہن کے مستقبل پہ کوئی حرف نہیں آ رہا......وہ بدستور اپنی دنیا میں مست تھا......شاہد کی والدہ نے عامل سے شاہد کے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو عامل نے قدرے توقف کیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا......شاہد کی والدہ کو فکر لاحق ہو گئی......پھر عامل سوچوں کے گہرے سمندر سے نکلا اور کہنے لگا "فکر نہ کریں...... بہت جلد شاہد کو اُس کی منزل مل جائے گی اور وہ نشے سے بھی باز آ جائے گا۔

بعض اہلیانِ محلّہ عامل کی حرکات وسکنات سے سخت نالاں تھے مگر کوئی بھی کچھ کہنے کو منہ نہ کھولتا بلکہ اپنے آپ سے سوال کرتا اور خود ہی جواب دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا گویا اپنی خودی میں مست تھا۔

پھر ایک دن محلے سے ایک کم سن بچی غائب ہو گئی والدین نے پورے محلے میں تلاش کیا، بات محلے سے نکلی تو پورے شہر میں پھیل گئی، مساجد میں لاؤڈ اسپیکر پہ اعلان کرائے گئے مگر لاحاصل......سدرہ والدین کی لاڈلی اور اکلوتی اولاد تھی شیخ محمد امین محلے کا سب سے زیادہ صوم و صلوٰۃ کا پابند...... ہر اچھے کام میں پہل کرنے والا ہمدرد انسان تھا......وہ اپنے تئیں تلاش میں لگا رہا مگر ناکام رہا۔

پھر تھانے میں رپورٹ درج ہوئی اور پولیس نے تفتیش شروع کر دی ہفتہ گزرنے کو تھا جب پولیس نے مجرم گرفتار کیا مجرم محلے کا نشوئی شاہد نکلا......شاہد کے سر پر والد کا سایہ نہ تھا اور والدہ کی وہ کہاں مانتا تھا جب شاہد سے پوچھا گیا کہ بچی سدرہ کہاں ہے تو وہ پولیس کے ساتھ نئے قبرستان کے عقب میں موجود پرانے کھنڈر نما قبرستان میں لے گیا اس نے جگہ کی نشاندہی کی کھدوائی شروع ہوئی تو ایک کالے رنگ کے کپڑے سے بچی کے جسم کے اعضاء کے ٹوٹے مل گئے۔

شاہد نے اقرار جرم تو کیا مگر جب اس سے پوچھا گیا کہ ٹکڑے کیوں کیے تو وہ بولا عامل نے کہا ایک بچی جو گناہوں سے نا آشنا ہو اس کے وجود کے ٹکڑوں کی ضرورت ہے......لہٰذا اس نے عامل کے کہنے پر ایسا کیا۔

پولیس عامل کو بھی ڈھونڈ نے نکل کھڑی ہوئی مگر وہ روپوش ہو چکا تھا روپوش ہونے کے باوجود وہ اپنی ایک نشانی چھوڑ گیا تھا جو شاہد کے گھر اُس کی اکلوتی بہن کے پاس پل رہی تھی۔

نیند

اُس کا گھر محلے کی نکڑ کے ساتھ دوسرے نمبر پہ واقع تھا۔گھر کیا تھا والدین کی جانب سے دومرلے زمین وراثت میں ملی تھی جس پر ایک کمرہ ایک غسل خانہ اور کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھپرا اور چھپر کے سامنے جونہی برآمدہ شروع ہونے کو ہوتا تو بیرونی دروازہ آ جاتا...... دروازہ کھول گلی کو جا......یہی کل اثاثہ تھا......طاہر علی کبھی کبھی دنیا سے اُکتانے لگتا۔اسے اپنی زندگی بے مزہ، بے رنگ محسوس ہونے لگتی۔جب اُس کی نظر گلی میں موجود دوسرے مکانوں پہ جاتی یا جو کبھی وہ اُن گھروں کے متعلق سوچتا جن کے پاس کل اثاثہ طاہر کے اثاثے کے برابر تھا مگر ساتھ ہی بھوک اور ننگ بھی تھی تو وہ قدرے مطمئن ہو جاتا...... چلو دال ساگ ہی سہی لیکن زندگی باعزت تو گزر رہی ہے......شہر میں اب گھر تیزی سے ختم ہو رہے تھے کیونکہ اس محلے کے چاروں جانب سڑکیں اور سڑکوں کے کنارے بڑی مارکیٹیں اور پلازے بن چکے تھے، محلے میں بھی کئی پیسے والوں نے اوپر رہائش بنا لی اور نیچے دکانیں کرایے پہ چڑھا رکھی تھیں، اس طرح یہ محلّہ اب محلّہ نہیں رہا تھا ایک وقت تھا جب محلے میں خاموشی اور سکون تھا کسی گھر سے آواز آتی تو فوراً پورا محلّہ جان لیتا کہ کہاں کیا ہوا ہے......مگر اب ایسا شور و غل تھا کہ دماغ پھٹنے لگتا، آئس کریم والا چیخیں مار مار کے جاتا تو غبارے والا آن ٹپکتا، اس سے جان خلاصی ہوتی تو کوئی سبزی فروٹ ریڑھی پہ لیے سستی سبزی کی صدائیں دیتا، جب وہ لوٹ جاتا تو سامنے موجود درزی کی دکان سے گانے سننے پہ مجبور کیا جاتا، درزی کو آرام ملتا تو ساتھ والے دودھ دہی کی دکان پہ لوگوں کا ہجوم شور و غل کا باعث بن جاتا، طاہر علی کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ گاؤں کے لوگ کس قدر آرام کی زندگی گزار رہے ہیں نہ تو ہر وقت کی چیخ چیخ نہ ہی گڑ گڑ...... یہاں کسی کو کوئی کیسے منع کرے اور پھر منع کرے بھی کیوں......؟ ایک بار درزی

سے کہا کہ جناب جب کپڑے سینے ہوں تو اپنی دکان کا دروازہ بند کر لیا کرو ویسے بھی تو شیشے کا دروازہ ہے، اندر بیٹھے نظر تو آتے ہو، اُس نے ایک ہی جواب دیا کہ میں کرایہ دیتا ہوں جو جی میں آئے گا کروں گا، آپ اپنی راہ لیں......وہ دن بڑی مشکل سے گزرا عید آ رہی تھی پوری پوری رات مشینوں کی گڑگڑ نے بے چین کیے رکھا، اُسے محسوس ہوتا کہ ابھی دماغ کی رگ پھٹ جائے گی، آنکھوں آنکھوں میں رات گزر گئی......صبح اللہ اللہ کر کے جان چھوٹی، بستر پہ لیٹا چادر کو کانوں کے گرد خوب زور سے دونوں کہنیوں میں دبا کر سونے کی کوشش میں تھا جب زور سے دروازے پہ دستک ہوئی، جسم میں اتنی سکت نہ تھی کہ جا کر دروازہ کھول دے، اندر سے چیخے جا رہا تھا مگر شاید اس کی آواز باہر تک نہیں پہنچ رہی تھی، بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا، ایک لڑکی ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی......اللہ کے بندے میری مدد کر......اللہ تیری مدد کرے گا......طاہر علی غصے سے اُس کی جانب دیکھتا رہا مگر وہ تھی کہ مسلسل چلائے جا رہی تھی......رے اللہ کے بندے میری مدد کر......اللہ تیری مدد کرے گا...... جیب میں سے دو روپے کا سکہ نا چاہتے ہوئے نکال کر اُسے تھمایا اور جان چھڑائی......بستر پہ پہنچا، پہلے ہی کی طرح چادر کو کانوں اور سر کے گرد مضبوطی سے گھما کر ہاتھوں سے دبا کر دائیں کروٹ لیٹ گیا......

نیند کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے یہ ایسا نشہ ہے جو بدن کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے اور انسان کی حالت عجیب سی بن جاتی ہے......وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اب سو کر شام ہی کو اٹھے گا ذہن پُرسکون ہو کے آنکھوں کو بند کر رہا تھا کہ ایک اور آواز نے پورے وجود میں تھرتھری پیدا کر دی......تازہ سبزی والا......آلو والا......ٹماٹر والا...... گوبھی والا......مٹر والا......بھنڈی والا......اُس کا جی چاہا کہ جا کر اس سبزی والے کی گردن مروڑ دے......وہ خود سے ہم کلام ہوا ''یہ سبزی والا الو کا پٹھا، بے وقوف اور جاہل ہے، اتنی عقل نہیں اسے کہ ساتھ بڑی سبزی منڈی موجود ہے جس کو سبزی لینی ہو گی وہاں سے لے لے گا یہ ریڑھی لیے کیوں گشت کر رہا ہے، جائے کسی دور دراز علاقے میں......'' مگر سبزی والا مسلسل صدائیں لگا رہا تھا......طاہر علی نے کروٹ بدلی کہ چلو دو چار

منٹ میں چلا جائے گا، سامنے والے گھر کے دروازے کھلنے کی آواز آئی، ریڑھی والا جیسے کہ گلے میں لاؤڈ اسپیکر لگائے بول رہا تھا، بلند آواز میں بولا ''جی باجی......!!'' اُسے سامنے والوں پہ بھی غصہ آیا، سامنے والے بھی پڑھے لکھے جاہل ہیں......

بھنڈی کس طرح ہے......؟

اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے والی عورت نے بھی اپنے گلے میں لاؤڈ سپیکر لگا رکھا ہے

۴۵ روپے کلو......ریڑھی والے کا جواب سنائی دیا

ارے اتنی مہنگی......اب کے عورت کا جواب بھی اسی لہجے میں سنائی دیا

''اللہ تیرے گلے کو خراب کرے......'' طاہر علی نے دل ہی دل میں اُسے بددعا دی

آدھا کلو دے دو......بیس روپے دوں گی......پھر عورت کی وہی بلند آواز سنائی دی

چلیں دے دیں......ریڑھی والا گویا ہوا، پھر ریڑھی چلنے لگی اور اس کی حد درجہ بھدی آواز......تازہ سبزی والا......آلو والا......ٹماٹر والا......گوبھی والا......مٹر والا......بھنڈی والا......

طاہر علی نے کروٹ بدلی اور تکیہ میں سر کو بھی دھنسا لیا......وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولا ''وہ لوگ کتنے پُرسکون ہوتے ہوں گے جن کے بڑے بڑے گھر ہوں گے، گیٹ سے کمرے تک آواز تو پہنچتی ہی نہ ہوگی، رات کو سکون کی نیند کے مزے لے کر صبح تازہ دم اُٹھتے ہوں گے نہ شور وغل، نہ چیخ چیخ، نہ گڑ گڑ......ایک ہم ہیں جو جیتے جی جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں......دنیا ملی تو جہنم جیسی......مر کے بھی جہنم کا ایندھن بن جائیں گے......پھر سوچنے لگا......نہیں نہیں......ہم جنت میں جائیں گے اللہ عزوجل نے یہاں جہنم دے دی......بس کافی ہے، وہاں ہم مزے کریں گے......وہ خود کو تسلیاں دینے لگا......'' اُس نے کروٹ بدلی، سر کی چادر کروٹ بدلنے سے قدرے ڈھیلی ہو چکی تھی، دوبارہ سے گردن کے نیچے سے گھما کر کانوں اور ماتھے سمیٹ لپیٹنے لگا......آنکھیں کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں اور جسم ایسے محسوس ہوتا تھا کسی نے نچوڑ ڈالا ہو جس طرح گنے کی مشین میں گنا ڈالنے سے صرف پھوک بچ جاتا ہے ایسی ہی حالت اس کے وجود کی تھی......اب قدرے

خاموشی تھی وہ سونے کے لیے تیار تھا پیاس ستانے لگی معدہ خالی تھا دل بھی متلانے لگا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی قے کر دے گا، طبیعت ناسازسی محسوس ہونے لگی، اٹھا اور سامنے رکھے مٹکے سے گلاس بھرنا چاہا مگر مٹکا تو خالی تھا، چارپائی کے نیچے رکھے گھڑے میں پانی تھا،تھوڑا سا پانی گلاس میں اُنڈیل لیا، دو گھونٹ پانی پینے سے کافی بہتری محسوس کرنے لگا پھر وہ بستر پہ پیٹ کے بل لیٹ گیا، اسے چارپائی کے اندر سے گڑ گڑ کی آواز آنے لگی، اس نے آواز کا تعاقب کیا تو آواز قدرے کم ہو کر گانے کی صورت میں نمودار ہوئی، وہ خاموشی چاہتا تھا مگر اِس محلے میں جہاں اکثر رہائش گاہیں مارکیٹوں میں بدل چکی تھیں خاموشی کہاں ممکن تھی، شاید درزی دوبارہ آ چکا تھا وہ درزی کو جن کا بیٹا کہتے ہوئے گالیاں دینے لگ پڑا......عید کا مطلب یہ تو نہیں کہ لوگوں کا سکون غارت کیا جائے کہاں لکھا ہے کہ عید پہ نئے کپڑے بھی زیب تن کیے جائیں......اسلام کا مذاق بنا رکھا ہے گندے غلیظ لوگ......اُسے رہ رہ کر لوگوں پر بھی غصہ آنے لگا جو عید پر نئے کپڑے سلوانے کے لیے درزیوں کی دکانیں بھر دیتے ہیں اور یہ درزی دن رات ایک کر کے اپنی جیب تو بھرتے ہیں اور ساتھ میں کئی لوگوں کی نیند بھی حرام کرتے ہیں...... وہ پورے معاشرے، روایات، کپڑے کے بیوپاریوں اور درزیوں کو گالیاں دیئے جا رہا تھا......

کروٹیں بدل بدل کے بھی نیند کی کوشش ناکام رہی، وہ غصے سے اٹھا اور دروازہ کھولتے ہوئے سامنے درزی کو گالیاں دیتے ہوئے اُس کی جانب لپکا، دکان کے باہر لگے شیشے کو زور سے مکا مارا......شیشہ کرچی کرچی ہو گیا......درزی کے ہاں کام کرنے والے پہلے تو سہم سے گئے انہیں سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا ہوا ہے اور جب درزی نے دیکھا کہ یہ تو طاہر علی کا کرتوت ہے تو سب اُس کی جانب لپکے......پھر کیا تھا......شور ہی شور......کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی...... پہلے تو خوب مکے دھکے ہوئے......کپڑے خون میں رنگ گئے......کئی بیچ میں چھڑانے کے لیے شامل ہوئے پھر پولیس کی گاڑی پہنچ گئی......

کہاں ہے......کہاں ہے......؟ پولیس اہلکار گاڑی سے اُترتے ہوئے دھاڑے

یہ ہے...... یہ ہے......!! درزی کے ملازمین نے طاہر علی کی جانب اشارہ کیا
پولیس کے ایک ہٹے کٹے اہلکار نے طاہر علی کو کالر کی پچھلی جانب سے پکڑا اور اس طرح اٹھایا جیسے مزدور بوری اٹھاتے ہیں جبکہ ساتھ والے اہلکاروں نے طاہر علی کی کمر پہ لاٹھیوں کی برسات شروع کر دی...... طاہر علی کراہ رہا تھا، اہلکار نے اُسے گھماتے ہوئے سامنے کھڑی پولیس وین میں پھینک دیا، گرتے ہی طاہر علی کی آنکھوں کے سامنے تارے گردش کرنے لگے، اسے سورج کی کوئی کرن دکھائی نہ دی، ایسے محسوس ہوا جیسے رات کے تارے اس کی کھلتی آنکھوں کے سامنے اِدھر اُدھر رقص کر رہے ہیں......

اسے پیٹھ پر اہلکاروں کی لاٹھیوں کی وجہ سے کافی درد محسوس ہو رہا تھا، اتنے میں اہلکار بھی گاڑی میں سوار ہو گئے اور طمانچوں کی برسات شروع کر دی...... طاہر علی صرف ہائے وائے کی آوازیں نکال رہا تھا...... تھانے جا کر چھترول کی اور لاک اپ میں بند کر دیا...... تھانے میں قدرے خاموشی تھی یا شاید طاہر علی کی حسِ سماعت میں خلل در آیا تھا، وہ گہری نیند سو گیا......
جب اُسے زور کی لات لگی تو آنکھ کھلی۔ وہ درد تو محسوس کر رہا تھا مگر اُس کی نیند کافی حد تک پوری ہو چکی تھی۔ اُسے اہلکار تھانے سے نکل جانے کے لیے کہنے لگے مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود اُٹھنے سے قاصر تھا۔ پھر اہلکار آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد اُسے ہسپتال داخل کروا دیا گیا جہاں اُسے نیند کے ٹیکے بھی لگا دیئے گئے۔

آج وہ قدرے سنبھلا تو سوچنے لگا کہ وہ ہسپتال کب، کیسے اور کیوں پہنچا......؟ وہ ہسپتال کے بستر پر ماضی کی گزری روداد یاد کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ کئی ڈاکٹر حضرات آپس میں یہی گفتگو کر رہے تھے کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سخت چوٹ سے اپنی جگہ سے کافی ہٹ چکے ہیں اور اُسے اپنی باقی زندگی بستر پہ لیٹے ہوئے گزارنی ہے......

وبالِ جان

آج کے دلخراش واقعے نے سب کو افسردہ کیا ہوا تھا۔کافی دیر تک ہوٹل کے کمرے میں خاموشی رہی پھر نصیر گویا ہوا......

کیا چائے نہیں پلاؤ گئے؟

احمد نے بیرے کو آواز دی......شفیق......او! شفیق......

آیا جناب......

تین چائے میٹھا کم پتی تیز،......۔

لایا جناب...... کہہ کر شفیق چائے لینے چلا گیا۔

پھر احمد نے نصیر سے کہا ''اصل واقعہ کیا ہے؟''

نصیر نے قدرے سوچتے ہوئے کہا ''ہماری معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے پھیلا دیتے ہیں اور وہ بھی اِس طرح سے کہ جیسے جو ہوا اُس کے عینی گواہ ہم ہی ہیں اِس طرح ایک جھوٹی بات کئی دلوں میں نفرت، کئی لوگوں پر الزام تراشی اور بہتان کا موجب بنتی ہے''۔

احمد نے نصیر کے ساتھ مکمل اتفاق کرتے ہوئے پوچھا '' آج تو آپ نے خود بہت کچھ دیکھا''۔

نصیر نے ماتھے پر رکھا ہاتھ اٹھا کر اپنے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا......''میں گاؤں سے واپس آ رہا تھا کہ چاندنی چوک کی جانب سے فائرنگ کی آواز آئی۔لوگوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ کچھ دیر کے بعد دو فائر ہوئے۔ میں نے

گاڑی ایک جانب کھڑی کر دی۔ چند جان پہچان والوں سے پوچھا کہ فائرنگ کیوں ہوئی ؟وہ بولے چوک میں جھگڑا ہو گیا ہے۔اچانک ایک برسٹ کی آواز نے دل ہلا کر رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی تمام دکانیں بند ہو گئیں۔ دکاندار ایسے غائب ہوئے جیسے ''گدھے کے سر سے سینگ''۔

نصیر نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا...... ''پہلے تو جی چاہا کہ واپسی کی راہ لوں......مگر نہ چاہتے ہوئے بھی میں چاندنی چوک کی جانب گیا تو سامنے والی تمباکو کی دکان کے پاس ایک شخص کراہتا ہوا نظر آیا۔ چوک کی دوسری جانب سفید کپڑوں میں ملبوس نوجوان کے کپڑوں کا رنگ سرخی میں بدل چکا تھا جبکہ ہوٹل کے پاس ایک نوجوان آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ میں جہاں تھا وہاں سے نہ میرے قدم آگے کو اٹھتے تھے نہ پیچھے......کچھ دیر وہاں کھڑا ہونے کے بعد واپس پلٹ آیا''۔

احمد بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ کہنے لگا

''کیا تینوں اس وقت زندہ تھے؟''

نصیر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا ''میرے خیال میں ایک تو وہیں ختم ہو چکا تھا جبکہ دو اس وقت آخری سانسیں لے رہے تھے''۔

نصیر کے لہجے سے افسردگی عیاں تھی۔اتنی دیر میں شفیق چائے لے آیا۔اویس جو کافی دیر سے خاموشی سے سب سن رہا تھا چائے پیالیوں میں ڈالنے لگا۔نصیر اور احمد کی جانب پیالیاں بڑھا کر پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے کمرے کی چھت کو دیکھنے لگا۔ احمد نے چائے کی چسکی لی اور کہا...... ''چائے تو زبردست ہے''۔

نصیر نے چائے کی پیالی کو غور سے دیکھا۔

اویس چھت کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''نصیر بھائی! اگر اس وقت انہیں اسپتال پہنچا دیا جاتا تو شاید وہ بچ جاتے''۔

''ہاں شاید بچ جاتے مگر تھانے اور کچہری کے چکر بھی تو بچانے والے کو لگانے پڑتے''۔نصیر نے پیالی اٹھا کر چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

......''یہی تو ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ ایسے مواقع پر لوگ کسی کی مدد نہیں کرتے۔ ایکسیڈنٹ ہو، جھگڑا ہو، یا کوئی بھی واقعہ۔ ہر ایک وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے''۔......اویس نے چھت سے نظریں ہٹا کر نصیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو ہمارا نظام ہی ایسا ہے''۔احمد نے بات آگے بڑھائی۔

''دراصل امن وامان قائم کرنے والے ادارے بالخصوص پولیس دیر سے پہنچتی ہے''۔

نصیر نے احمد کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا''ہمارے ملک کے حالات پھر ملکی قوانین اوران کی پیچیدگیاں......وہ بھی کیا کریں۔جبکہ عوام کے اپنے مسائل ہیں''۔

احمد نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے اویس کی طرف دیکھا جو یہ سب سن کر پریشان نظر آ رہا تھا۔ پیالی میز پر رکھتے ہوئے احمد نے پھر سوال کیا......''کیا کوئی عداوت تھی؟ انتہائی قدم اٹھانے کے پسِ پردہ ضرور کوئی بڑی بات ہوگی؟''۔

''جب میں گاڑی لے کر مارکیٹ کی اوپر والی جانب گیا تو وہاں ٹولیوں میں لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے مگر صاف بات نہ تو کوئی کر رہا تھا۔ نہ ہی پوچھنے پر بتا رہا تھا۔آدھی آدھی باتیں جن سے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی''۔نصیر نے جواب دیا۔

بیرا چائے کی خالی پیالیاں اٹھا کر لے جا رہا تھا تو سجاد بھی کمرے میں داخل ہوا۔ دعا سلام کے بعد......کافی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی......سجاد نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ''آج تین قتل ہوئے۔ بڑا عجیب واقعہ ہوا۔تینوں جوان تھے اور وجہ بھی کوئی خاص نہ تھی''۔

کمرے میں بیٹھے احمد، نصیر، اویس کی توجہ بھی سجاد کی جانب ہوگئی۔ تینوں یک بار کہہ اٹھے......''سجاد!وجہ کیا تھی؟تمہیں معلوم ہے؟''

سجاد نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں رکھا اور ماچس کے لئے جیب ٹٹولتے

ہوئے بولا......''ماچس ہے؟''

احمد نے ماچس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے شرارت سے کہا''......سگریٹ کے ساتھ ماچس بھی جیب میں رکھا کرو......ہمیشہ ماچس مانگتے رہتے ہو''۔

سگریٹ سلگا کر سجاد نے لمبا کش لیا اور کہنے لگا''کوئی خاص بات نہیں تھی (یہ سجاد کا تکیہ کلام بھی تھا)''......

نصیر نے غصے کے عالم میں کہا''......تین جوان دن دہاڑے چوک میں مار دیئے گئے اور تم کہتے ہو......''کوئی خاص بات نہیں تھی''......بم پھٹ جائے تو تم کہتے ہو''کوئی خاص بات نہیں تھی''سمندر امڈ آئیں......ملک میں آگ لگی ہو۔لوگ سرِ عام زندگیوں سے ہاتھ دھو رہے ہوں۔تم سے جب بھی پوچھا گیا تم نے کہا''کوئی خاص بات نہیں تھی''عجیب آدمی ہو تم؟

سجاد نے اطمینان سے دوسرا کش لیتے ہوئے کہا......''اللہ کے بندو! بتاتا ہوں......''......پھر خاموش ہو گیا......کچھ توقف کے بعد بولا......''چائے پی چکے ہو؟''......

احمد نے کہا......''ہم تو پی چکے ہیں......تم اپنے لیے کہہ دو......

سجاد نے بیرے کو ایک چائے کا آرڈر دیا۔

''مرنے والوں میں دو سگے بھائی محمد علی، قاسم علی اور ایک پھوپھی زاد پرویز تھے''۔سجاد نے پھر سے بات شروع کی۔

''محمد علی کی کسی لڑکی سے دوستی تھی۔گو کہ محمد علی اس سے شادی کا خواہش مند تھا مگر وہ لڑکی عجیب ہے۔پچھلے دِنوں ان کے آپس میں تعلقات خراب رہے۔کافی گلے شکوے بھی ہوتے رہے۔پھر آج کل موبائل نے ہمارے معاشرے بالخصوص غیر مہذب حرکات کرنے والوں کے لیے پیغام رسانی آسان کر دی ہے۔اب تو لوگ موبائل سے پیغام ایک دوسرے تک سہولت سے پہنچا دیتے ہیں''۔

محمد علی کی دوستی کس سے تھی؟......احمد نے کریدنے کے انداز پوچھا۔

''ناظمہ سے......''

''تم تو جانتے ہو اُسے......؟'' ......سجاد نے کہا۔

''آج کے اس اندوہناک واقعے کی کچھ حقیقت معلوم ہے تو بتاؤ؟'' ۔احمد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

سجاد کرسی کو درست کرتے ہوئے بولا ......''بات یہ ہے کہ کچھ دنوں سے ناظمہ نے اپنا فون اپنی سہیلی کو دے رکھا تھا۔ بدقسمتی سے ناظمہ کی سہیلی فون کالز ریسیو کرتی رہی۔ ناظمہ نے اپنی سہیلی سے کہا تھا کہ کچھ دن وہ فون اپنے پاس رکھے۔مگر ناظمہ کی سہیلی کے بھائیوں نے اپنی بہن کے پاس موبائل دیکھا تو اُسے بُرا بھلا کہتے ہوئے موبائل لے لیا۔ اِدھر محمد علی بار بار محبت بھرے ایس ایم ایس کرتا رہا...... جو لڑکی کے بھائیوں نے پڑھ لیے۔نمبر سے محمد علی کی شناخت بھی ہوگئی حالانکہ ان کی بہن نے صاف طور پر کہا بھی کہ یہ موبائل اس کا نہیں ...... بلکہ اس کی سہیلی ناظمہ کا ہے۔مگر وہ نہیں مانے''۔

سجاد نے کرسی پر پہلو بدلا اور بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اُن کا آمنا سامنا چوک میں ہوا۔ پہلے باتیں ہوئیں پھر اچانک ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔محمد علی کو سر پر گولی لگ گئی۔سامنے مارکیٹ میں قاسم علی اور پرویز کپڑے کی دکان سے کپڑے لے رہے تھے۔ جب بھگدڑ مچی تو وہ بھی بھاگ کر دکان سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر جب انہوں نے دیکھا کہ محمد علی خون میں لت پت آخری سانس لے رہا ہے تو وہ معاملے کو بھانپ گئے''۔

احمد نے لقمہ دیا......''اتنی چھوٹی بات پر اتنا بڑا جھگڑا؟

''وہ بے وقوف سر پھرے ہیں''۔سجاد نے تیزی سے جواب دیا۔

''قاسم اور پرویز جب آئے تو پھر سے جھگڑا شروع ہوا۔اسی دوران دو گولیاں پسٹل سے پرویز پر داغی گئیں۔جن میں سے ایک اس کی ٹانگ جبکہ دوسری پیٹ میں لگ گئی۔ سجاد نے مزید تفصیلات بتائیں۔

''مگر برسٹ کی آواز آئی تھی''......نصیر نے ایک اور سوال کیا۔

''بالکل!......وہ جب قاسم علی انہیں للکارتے ہوئے گھر کی جانب اسلحہ لینے جانے لگا تو اس پر برسٹ داغا گیا تھا۔سب لوگ بھاگ رہے تھے۔دکانداروں کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ خریداروں کا جدھر منہ سیدھا ہوا ادھر کو ہی ہو لیے''۔سجاد نے کہا۔

''تمہیں ساری تفصیلات کس نے بتائیں......؟؟''احمد نے پوچھا۔

''میں سامنے موچی کی دکان کے باہر بنچ پر بیٹھا تھا۔میرے پاؤں میرے جسم کا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے''۔نصیر نے کہا۔

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ایسا تو ہونا ہی تھا۔اتنا خوف ناک منظر......خون ہی خون اور آناً فاناً نوجوانوں کا قتل۔جو کچھ دیر قبل اپنی دنیا میں مگن تھے دیکھتے ہی دیکھتے مارے گئے ۔یہ منظر میں ساری زندگی نہیں بھول پاؤں گا۔سجاد نے کہا۔

''کیا رپورٹ درج ہو چکی ہے؟اور پوسٹ مارٹم''......احمد نے استفسار کیا۔

سجاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا مارنے والے پھنس جائیں گے؟کوئی گواہی دے گا؟''......احمد نے اگلا سوال کیا۔

''مرنے والے واپس تو نہیں آئیں گے۔ایک چھوٹی سی غلط فہمی نے تین جوان نگل لیے اور ایک موبائل کے غلط استعمال نے گھروں کے چراغ گل کر دیے''۔سجاد نے جواب دیا۔

اسی دوران ایک نامعلوم نمبر سے بار بار نصیر کے موبائل پر کال آنے لگی۔جسے وہ بار بار رد کر رہا تھا۔

''سن لو''......احمد بولا۔

''نہیں......میں وہ نمبر نہیں سنتا جو میرے پاس ایڈ نہیں ہوتا''۔نصیر نے جواب دیا۔

دوبارہ کال آئی تو نصیر سے احمد نے موبائل لے کر''ہیلو''کہا۔

’’جی آپ کون ہو؟‘‘ ......دوسری جانب سے نسوانی آواز سنائی دی۔

’’پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں......احمد نے استفسار کیا۔

’’چھوڑیں اس بات کو......تعارف میں کیا رکھا ہے......‘‘ دوسری جانب سے کہا گیا۔

احمد نے نمبر کاٹ دیا۔

نصیر نے پوچھا......’’کون ہے؟

’’......کوئی خاتون تھی‘‘۔احمد نے جواب دیا۔

’’ایسے بہت سے نمبر آتے ہیں۔کس کس کو منع کریں پھر ’’سمیں‘‘ بھی تو کسی کے نام نہیں۔ایسی کالز اور ایسے نمبروں کا کچھ نہیں ہوتا......اور ہماری قوم ہر سہولت کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔نصیر نے لگا تار بولتے ہوئے کہا۔

وہ بات ہی کر رہا تھا کہ دوبارہ اسی نمبر سے فون کال آنے لگی۔نصیر نے فون لے کر کہا ’’......جی جناب!‘‘

دوسری جانب سے ایک نسوانی آواز آرہی تھی......

’’تم جیسی ہی لڑکیوں کی وجہ سے آج تین جوان سرِ عام دن دیہاڑے چوک میں مارے گئے‘‘......نصیر نے یکدم غصے سے کہا تو سب چونک پڑے۔اسی دوران نصیر نے فون کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

دوسری جانب سے آواز آئی ......’’پلیز آپ غصہ نہ کریں...... بتائیں ناں آپ کون ہیں؟‘‘

نصیر نے جواباً کہا ......’’آپ کو شرم نہیں آتی......فضول کالیں کر کے لوگوں کو تنگ کرنے کا فائدہ؟‘‘

’’آپ تو بے حد غصے والے لگتے ہیں؟ آپ کون ہیں بتائیں ناں‘‘......آواز آئی۔

’’کچھ شرم کریں......اور میرا وقت برباد نہ کریں......نصیر نے جواب دیا۔

''اچھا آپ اپنا نام بتائیں ناں؟......پھر تقاضا کیا گیا۔

''تمہاری..................''......نصیر نے غصے سے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دفعہ پھر گھنٹی بجی......اس دفعہ نمبر جانا پہچانا تھا۔

''اسلام وعلیکم بھائی!''......نصیر نے فون اٹھا کر کہا۔

''وعلیکم السلام''............واقعی پہلے فون پر میری آواز نسوانی ہی لگتی تھی؟''............اس نے پوچھا۔

''کون تھا؟''......احمد نے بڑی ناگواری سے پوچھا۔

''میرا ایک شیطان دوست تھا''......نصیر نے جواب دیا۔

''ایسے ہی فضول قسم کے لوگوں کی وجہ سے موبائل فون وبالِ جان بنتا جا رہا ہے۔ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی اور آج کے واقعہ کے بعد تو ہم سب کو عبرت حاصل کرنی چاہئیے''......احمد نے بات ختم کر دی۔